معارف کا زر تعاون

ہندوستان میں سالانہ اسّی روپیے

پاکستان میں سالانہ دو سو روپیے — فی شمارہ سات روپیے

دیگر ممالک میں سالانہ — ہوائی ڈاک بیس پونڈ یا بتیس ڈالر

بحری ڈاک سات پونڈ یا گیارہ ڈالر

پاکستان میں ترسیل زر کا پتہ : حافظ محمد یحییٰ، شیرستان بلڈنگ

بالمقابل ایس۔ ایم۔ کالج۔ اسٹریچن روڈ۔ کراچی

• سالانہ چندہ کی رقم منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں۔ بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY
AZAMGARH

• رسالہ ہر ماہ کی ۱۵ تاریخ کو شائع ہوتا ہے۔ اگر کسی مہینہ کے آخر تک رسالہ نہ پہونچے تو اس کی اطلاع اگلے ماہ کے پہلے ہفتہ کے اندر دفتر میں ضرور پہونچ جانی چاہیے۔ اس کے بعد رسالہ بھیجنا ممکن نہ ہوگا۔

• خط و کتابت کرتے وقت رسالہ کے لفافہ کے اوپر درج ۔ خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔

• معارف کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی۔
کمیشن ۲۵٪ ہوگا۔ رقم پیشگی آنی چاہیے۔

جلد ۱۶۷ — ماہ صفر المظفر ۱۴۲۲ھ مطابق ماہ مئی سنہ ۲۰۰۱ء — عدد ۵

فہرست مضامین

شذرات

۱۵ اپریل کو دار المصنفین شبلی اکیڈمی کا جلسۂ انتظامیہ ہوا جس میں عالی جناب سید حامد صاحب چانسلر جامعہ ہمدرد دہلی، پروفیسر ریاض الرحمٰن خاں شروانی علی گڑھ، مولانا محمد سعید مجددی بھوپال، مولانا ابو محفوظ الکریم معصومی کلکتہ، پروفیسر مولانا تقی الدین ندوی مظاہری ابو ظبی اور مقامی ارکان مرزا امتیاز بیگ ایڈوکیٹ اور ڈاکٹر سلمان سلطان نے شرکت فرمائی، ۱۴ اپریل کو مغرب بعد جناب سید حامد کی تقریر کا پروگرام تھا جلسے کی صدارت مولانا سعید مجددی نے فرمائی، سید صاحب نے مسلمانوں کو تعلیمی پس ماندگی دور کرنے، حصول علم کے لئے محنت و ریاضت کرنے، فقہی اور مسلکی اختلافات سے بچنے اور ملک و بیرون ملک میں اپنے خلاف ہونے والی سازشوں سے ہوشیار رہنے کی تلقین اس پُر اثر انداز میں کی کہ معلوم ہوتا تھا از دل خیزد بر دل ریزد، صدارتی تقریر میں مسلمانوں کو اپنی سیرت و کردار سنوارنے اور غیر مسلموں کے ساتھ بہتر سلوک کرنے پر زور دیا گیا تھا، جلسے میں شہر کے معززین اور وکلا بڑی تعداد میں شریک ہوئے، اس سال ہمارے رفیق کار مولوی حافظ عمیر الصدیق دریابادی ندوی کو اترپردیش اردو اکادمی نے مولانا امتیاز علی عرشی ایوارڈ دیا ہے خاکسار اور سید حامد صاحب نے انہیں تہنیت پیش کی۔

انتظامی جلسوں میں رسماً گزشتہ جلسے کی کارروائی، تعزیتی قرار دادیں، علمی و انتظامی شعبوں کی رپورٹ، گزشتہ سال کا حساب اور آئندہ سال کا بجٹ پیش کیا جاتا ہے، دار المصنفین کے جلسہ انتظامیہ میں بھی فاضل ارکان کو ادارے کے حالات سے باخبر کرنے کے لئے یہ کارروائیاں عمل میں آئیں اور دار المصنفین کی غیر اطمینان بخش مالی حالت کی طرف توجہ دلائی گئی، دار المصنفین کے سامنے کاموں کا وسیع لائحہ عمل ہے جس کو بروئے کار لانے کے لئے افراد اور کارکن نہیں، اس کے وسائل و ذرائع اتنے محدود ہیں کہ وہ اپنے موجودہ خدمت گزاروں کے مشاہروں میں جو بہت قلیل ہیں کوئی خاص اضافہ نہیں کر پاتا تو نئے تقرر کس طرح کئے جائیں، گرامی مرتبت ارکان نے بجا طور پر اس پر فکر و تشویش ظاہر کی اور راقم کو ممبئی کا سفر کرنے اور کتابوں اور معارف کی توسیع اشاعت کی مہم چلانے کی ہدایت فرمائی اور جولائی ۲۰۰۱ء سے معارف کا سالانہ چندہ ۱۰۰ روپے کر دینے کی سفارش کی۔

اعظم گڑھ سے خاکسار ۱۶ اپریل کو صبح پروفیسر شروانی، مولانا معصومی اور مولانا مجددی کے ہمراہ دار العلوم ندوۃ العلماء کے جلسہ انتظامیہ میں شرکت کے لئے روانہ ہوا تو پہلے مدرسۃ الاصلاح سرائے میر گیا، مہمانوں نے تعلیم گاہ اور مدرسہ اور طلبہ کے کتب خانے دیکھ کر مسرت ظاہر کی۔ ندوۃ العلماء کے جلسے کی خاص چیز اس کے ناظم مولانا سید محمد رابع ندوی کی رپورٹ تھی، جس میں اس کی ماضی کی کارکردگی اور علمی، تعلیمی، دعوتی اور تنظیمی میدانوں میں خدمات کا مرقع پیش کیا گیا تھا اور موجودہ دور کے لحاظ سے آئندہ کے پروگرام اور منصوبے بیان کئے گئے تھے، ندوۃ العلماء کو اللہ تعالیٰ نے بڑی شہرت و عظمت دی ہے اور اس کے وسائل و ذرائع بھی بہت وسیع ہیں، اس لئے اپنے عزائم میں اس کا کامیاب ہونا مشکل نہیں، مولانا محمد سالم قاسمی کی صدارتی تقریر بھی توجہ طلب تھی، ۱۸ اپریل کو مجلس تحقیقات و نشریات اسلام کا جلسہ تھا اس میں اس کے مسائل زیر بحث آئے اور اس کے علمی و تحقیقی کاموں کی توسیع اور بڑے شہروں میں مجلس کی مطبوعات کے تعارف اور فروخت کے مرکز قائم کرنے پر غور ہوا۔

جامعہ محمدیہ منصورہ مالیگاؤں چند ہی برسوں میں ایک بڑی دینی درسگاہ بن گئی ہے، اس میں طلبہ و طالبات کی الگ الگ درسگاہیں ہیں اور ان کو دینی و عصری تعلیم ساتھ ساتھ دی جاتی ہے اور مہاراشٹر بورڈ سے ہائی اسکول کے امتحان دلائے جاتے ہیں، جامعہ کے زیر اہتمام ایک طبیہ کالج اور سائنس اسپتال بھی کامیابی سے چل رہے ہیں، جامعہ کے سربراہ مولانا مختار احمد سلفی ندوی کی دعوت پر وہاں حاضری اور ۳۱ مارچ و یکم اپریل کو اس کے دو روزہ پروگرام میں شرکت کا موقع ملا، ایک اجلاس میں تقریر بھی کی۔ کویت سے شیخ طارق عیسیٰ اور محمد شائع بھی تشریف لائے تھے، ان کی اور مولانا مختار احمد ندوی کی تقریر سے حاضرین بہت محظوظ ہوئے، جامعہ کی شاندار اور خوش نما عمارتیں خصوصاً اس دفعہ اس کا پُرشکوہ اور فرنیچر سے آراستہ دار الضیافت دیکھ کر خیال ہوا کہ مولانا مختار ندوی کو علاء الدین کا چراغ تو نہیں مل گیا ہے۔

ایک روز مولانا عبد الاحد ازہری کی دعوت پر مالیگاؤں کی دوسری مشہور درسگاہ معہد ملت گیا اور تقریر کی اور اساتذہ و طلبہ سے تبادلۂ خیال کیا۔

شذرات

آزادی کے بعد نصاب تعلیم پر دیومالائی تصورات، ہندوانہ خیالات اور مشرکانہ عقائد کی چھاپ ڈالی جانے لگی اور مسلمانوں کے لئے اپنے ایمان وعقیدے پر قائم رہنا اور اپنا قومی وملی تشخص باقی رکھنا مشکل ہوگیا تو انہوں نے قومی تعلیم کے مسموم اثرات سے بچنے کے لئے اپنے بل بوتے پر آزاد مکاتب قائم کئے، نئے مدارس اور دینی درس گاہیں کھولیں اور اس کے لئے نہ حکومت پر بوجھ ڈالا اور نہ اس سے امداد واعانت کے طالب ہوئے، الحمدللہ ان کے اخلاص ومحنت سے آج اکثر مدارس اچھے اور بہتر حال میں ہیں اور برگ وبار بھی لارہے ہیں، سرکاری اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں کے مقابلے میں دینی مدارس کے اساتذہ کی تنخواہیں بہت کم ہیں مگر ان کے طلبہ کو تشدد، توڑپھوڑ، آتش زنی اور قتل وغارت گری سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا، لیکن مدارس کا یہ فروغ اور کامیابی موجودہ حکومت اور ہندوؤں کی احیائیت پسند جماعتوں کو بہت ناگوار ہے، ان کے خیال میں یہاں آئی۔ ایس۔ آئی کے ایجنٹ، جنگ جو اور خوفناک قسم کے لوگ رہتے ہیں، اس لئے پولیس ان کے ذمہ داروں کو تنگ اور جھوٹے مقدمات میں پھنسا رہی ہے اور بے گناہی کے باوجود طرح طرح کی اذیتیں دے رہی ہے اور حکومت کی ساری مشنری مدارس کے ذرائع آمدنی کا پتہ لگانے میں مصروف ہے، اترپردیش حکومت کے سامنے فرقہ وارانہ کشیدگی بڑھانے، مدارس کے پیچھے پڑجانے اور پرامن شہریوں کو پریشان کرنے کے علاوہ کوئی نشانہ ہی نہیں رہ گیا ہے۔

اوپر ذکر آچکا ہے کہ نئی ششماہی یعنی جولائی ۲۰۰۱ء سے معارف کا سالانہ چندہ ۱۰۰ روپے ہوجائے گا، یہ اضافہ مناسب ہے، جس کو امید ہے معارف کے قدرداں بطیب خاطر گوارا کرلیں گے، ہم بار بار مفت معارف بھیجنے سے اپنی معذوری ظاہر کرچکے ہیں مگر اس کے باوجود برابر اس کے لئے خطوط آتے رہتے ہیں، جن کی تعمیل ممکن نہیں۔

مقالات

نفسیات اکیسویں صدی میں

از

پروفیسر معزز علی بیگ صاحب*

سبق ملا ہے یہ معراج مصطفیٰ سے مجھے   کہ عالم بشریت کی زد میں ہے گردوں

تمہید نفسیات پر مادہ پرستانہ فکر کے اثرات سترہویں صدی میں پڑنا شروع ہوگئے تھے اور یہ علمی طور پر قرن ماضی کے اول نصف حصہ میں پوری طرح نظر آنے لگے۔ ان اثرات کے تحت نفسیاتی علم نے انسان کے وجود کی کلیت اور اکائی کو درہم برہم کردیا۔ اس کے اس روحانی وجود کو جو ربانی قوتوں اور صفات کا حامل ہوسکتا ہے مفلوج کردیا۔ اور یہ نفسیات نے اپنا رشتہ روحانی اور اخلاقی اقدار سے توڑ کر زندگی کے اعلیٰ مقاصد کو فوت کردیا۔ انسان کو ایک مشین، ایک بھیانک جنگی جانور اور بازار میں بکنے والی ایک شے بناکر پیش کردیا، جس سے انسان کی عظمت، اس کا وقار خاک میں مل گئے اور انجام کار انسانی حقوق ذبح کردئے گئے۔

مادہ پرستانہ فکر نے سائنس اور منطق کا جامہ پہن کر نفسیات کو آمریت، سرمایہ دارانہ نظام اور آمرانہ جمہوریت کے لئے ایک آلہ کار بنادیا۔

---

* 15/43 گوداوری، وکاس نگر، لکھنؤ۔

سائنس اور منطق کا یہ جامہ دراصل بھیڑ کی وہ کھال ہے جس میں وہ بھیڑیا خود کو چھپائے ہوئے ہے جو اس انسان دشمن اور خدا بیزار تہذیب کا پروردہ ہے جس کی بربریت نے اسیریا اور روم سے اپنا لوہا منوالیا ہے۔ یہ انسان دشمن بازاری تہذیب اس "عدو مبین" کی وہ سازش ہے جو انسانیت کو نذر آتش کرنے جارہی ہے۔ چنانچہ اس نے اسی سازش کے تحت نفسیاتی اور عمرانی علوم کو اپنا آلہ کار بنالیا۔

لیکن قرن ماضی کے دوسرے نصف حصہ میں ایک فکری انقلاب نے ہمیں یہ بتادیا کہ یہ سائنس ایک جعلی اور مصنوعی سائنس یا سائنٹزم (Scientism) اور یہ منطق یا اس کی منطق حقیقت کی نفی ہے۔ یہ ایک دوئی (Dualism) سے ٹوٹے ہوئے تصور حقیقت (Out o logy) ایک تضاد سے بکھرے ہوئے نظریہ علم (Epistemology) اور بازاریت کی متعفن چادر میں لپٹے ہوئے نظام اقدار کی پیداوار ہے۔ اس فکری انقلاب نے جو راستہ کھولا ہے اس نے نفسیات کو انسانیت کی تعمیر نو کے لئے تیار کر دیا ہے جو موجودہ صدی میں ہمارے سامنے کچھ نتائج لائے گا۔

اکیسویں صدی کا نفسیاتی علم انسانیت کو کیا دے گا؟ اس کو جاننے کے لئے ہمیں پہلے بیسویں صدی کے پس منظر میں یہ دیکھنا ہوگا کہ ایک جھوٹی اور مصنوعی سائنس جس کو آج ہم سائنٹزم (Scientism) کہہ کر پکارتے ہیں کس ماخذ (Source) سے نکل کر آئی ہے، اسے اتنا فروغ کیوں اور کس طرح ہوا اور اس کا انہدام کیسے ہوا۔

بیسویں صدی کا پس منظر | ۱۹۵۸ء میں راقم التحریر نے امریکہ سے اپنے ایک خط[1] میں نہایت

صراحت کے ساتھ یہ لکھا تھا کہ بیسویں صدی کے اختتام تک نفسیات میں بعض تصورات ایک زبردست فکری قوت بن جائیں گے جن سے اس علم کے میدان میں ایک بنیادی تبدیلی آجائے گی۔ چنانچہ اس کے بعض رائج الوقت تحقیقاتی طریقے (Research Methods) برطرف کردئے جائیں گے۔

یہ صورت حال اس وقت ہمارے سامنے ہے اور اب یہ محسوس ہو رہا ہے کہ اس صدی کی دوسری دہائی (Second decade) تک جو ہونے والا ہے وہ کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ وہ ایک ایسی آنے والی تہذیب کا پیش خیمہ ہے جو انسان کے کھوئے ہوئے وقار اس کے مقام اور اس کی عظمت کو پھر سے واپس لے آئے گی۔ چنانچہ اس صورت حال اور اس کے پس منظر کو اس وقت سمجھ لینا بہت ضروری ہے

قرن ماضی کے پہلے نصف حصے میں نفسیاتی اور عمرانی علوم کو ایک مصنوعی اور جعلی سائنس (Pseudo Science) نے اس طرح اپنی گرفت میں لے لیا کہ اس کا ہر بامعنی اور کارآمد تصور بے کار اصطلاحوں کے جال میں پھنس کر مسخ ہوگیا۔ یہ دیکھ کر ڈاکٹر ایرک فروم (Dr. Eric Fromm) کی بات یاد آتی ہے جو معالجاتی نفسیات میں صف اول میں مقام رکھتے اور نوفرائڈی اسکول (New Freudian School) کے نمائندے ہیں کہ علم نفسیات کا مقصد مغرب کی عظیم فکری روایات کے مطابق یہ تھا کہ اس کے ذریعہ ایک خوش گوار اور اچھی زندگی کا سراغ لگایا جائے لیکن آج کے بازاری تمدن نے مسخ کر کے اس کو سیاسی پروپیگنڈے، اشتہار بازی اور بازاری حالات کی تحقیقات کا ذریعہ بنادیا ہے۔ اس مصنوعی سائنس کا ماخذ تلاش کر لینے اور اس کے فروغ پانے کے اسباب کو جان لینے سے ہماری سمجھ میں یہ آسانی سے آجائے گا کہ اس کا انہدام کیوں ہو رہا ہے۔ یہ انہدام دراصل ایک

---

[1] یہ بات اس خط کے ساتھ علی گڑھ سے نکلنے والے ایک جریدہ اسلامک تھاٹ میں شایع ہوئی تھی۔
Islamic thought ; july - Oct 1958 Vol No. 5 Issue No. 4

تاریخی عمل کا لازمہ ہے۔ اس جعلی سائنس کو آج ہم سائنٹزم (Scientism) کہتے ہیں کیونکہ کچھ چوٹی کے مفکرین نے اس کے لئے یہی لفظ منتخب کیا ہے۔ اب ہمیں اس کے ماخذ کو دیکھنا ہے۔

سائنٹزم کا ماخذ اس جعلی اور مصنوعی سائنس کا ماخذ تلاش کرنے کے لیے ہمیں مغربی فلسفہ کے ارتقاء پر نظر ڈالنا ہوگی۔ مغربی فلسفے کے دو ستون ہیں (۱) عقلیت (Rationalism) (۲) تجربیت (Empiricism) مغربی فلسفہ کی تاریخ اس امر کی پوری طرح شاہد ہے کہ یہ دونوں ستون مغربی افکار کی عظیم عمارت کو صدیوں سے تھامے ہوئے ہیں۔

بارہویں صدی میں یورپ میں جب عقلیت کی چند کرنیں ہی پڑی تھیں اور قرون مظلمہ کا اختتامی دور تھا، علامہ ابن رشد نے عقلیت کو اس کی معراج پر پہنچا دیا اور یہ واقعہ ہے کہ انہوں نے تجربیت کے فروغ کے لئے ایک سدراہ کو ہٹا دیا۔

عقلیت کو تجربیت سے قریب لانے میں سب سے بڑی کوشش سر فرانس بیکن نے کی انہوں نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب (Novum Organum) میں اس کو صراحت کے ساتھ بتایا ہے۔ انہوں نے سائنس کی آیندہ ترقی کی امید تمام تر تجربے کو عقلی صلاحیت سے ملا دینے پر موقوف کر دی، لیکن علمی اعتبار سے فرانس کے دیوقامت مفکر ڈیکارٹ (Des cartes) جو بیکن کے ہم عصر ہیں اپنے دور کے سائنس دانوں کی آراء کے تضاد اور اختلاف سے گھبرا کر قدرت کے کچھ بنیادی قوانین کی تلاش میں عقلیت کی بالادستی ہی کے قائل ہے۔ البتہ جو کام انہوں نے سائنس کا حق سمجھتے ہوئے کیا وہ دوئی (Duality) کا وہ تصور ہے جو (Cartesian Dualism) کے نام سے جانا جاتا ہے۔ حقیقت روح اور مادے کی دوئی سے عبارت خارجی حقایق یا (Res exteusa) داخلی حقایق یا (Res Cogitans

سے بالکل الگ ہیں۔ دوئی کا یہ وہ ورثہ ہے جو MIND - BODY مسئلہ بن کر تین صدیوں سے زیادہ نفسیات کو ایک نظریاتی جنگ میں الجھا رہا ہے[1] ڈیکارٹ کے بیان سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ جیسے دوئی قدرت کا کوئی ایسا تقاضہ ہے جس سے وہ خود مجبور ہے[2] چنانچہ انہوں نے اپنے نظریات کو ہمہ گیر قرار دیا اور سائنس میں سبب وعلت کی تحقیقات کو بنیادی تسلیم کیا[3]

دوئی کے تصور سے مادہ پرستانہ فکر نے ایک جڑ پکڑ لی۔ کیونکہ تجربیت کے ستون کو جیسے جیسے سائنس مغرب میں مسلسل ترقیات مضبوط بناتی گئیں ڈیکارٹ کے خارجی حقایق یعنی (Res exteusa) کو داخلی حقایق یعنی (Res Cogitans) پر فوقیت حاصل ہوتی چلی گئی۔ گویا جسم کو ذہن پر اور مادے کو روح (Spirit) پر ترجیح دے دی گئی۔ اس کا اثر مغرب میں نظر علم (Epistemology) پر اتنا زبردست پڑا کہ کسی کی یہ مجال نہیں رہی کہ وہ حواس، ٹھوس تجربے اور ظاہر کے علاوہ علم کے معاملہ میں کسی اور ذریعہ علم کا تصور بھی کر سکے۔

---

[1] D B Kliev. : A history of scientific psychology : Routledge and Kegan Paul : London : 1970.

[2] E.A Burtt. : Metaphysical Foundations of Modern Scieince : Doubleday Co. New York : 1954 pp 118 - 119

OEUVRES, Cousin ed: Paris, 1824 : Vol X p. 194 : OEVRES, Vol. XI pp 201 324.

[3] Blake and Ducasse amd Madden : Theories of Scientific Method : Washington Univ. Press : 1960, p. 85

اس کیلئے: S.O.: PRINCIPORIUM PHILOSOPHIAE :Part III Chapt.IV,VIII: pp. 81 - 82

یہ اثر نفسیات میں جس طرح آیا اور جو اثرات اس کے تحقیقات کے میدان میں پڑے وہ جیسا کہ آگے چل کر نظر آئے گا، نفسیاتی علم کے لئے تباہ کن ثابت ہوئے، مادہ پرستانہ فکر کی طویل تاریخ یہ بتاتی ہے کہ دوئی کے رشتے کو تجربیت سے مل کر جو تقویت حاصل ہوئی اس نے مادہ پرستانہ تصورات کو ایمان کا درجہ دے دیا[1] اس ایمان کو پختہ کرنے اور مادہ پرستانہ فکر کی جڑوں کو گہرا کرنے میں جس بات کو سب سے زیادہ دخل ہے وہ کلاسکی طبیعیات (Classic Physics) ہے کیونکہ ہمیں یہاں یہ ہرگز نہیں بھولنا ہے کہ نظریہ علم اور طبیعیات کا چولی دامن کا ساتھ رہا ہے[2] جو اس گفتگو میں ثابت ہوتا چلا جائے گا چنانچہ آگے بڑھنے سے قبل ہمیں اس کو دیکھنا ہوگا۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ ہمیں اس زبردست غلط فہمی سے پوری طرح بچنا ہوگا کہ اس دور کا کوئی سائنس داں یا بیکن یا ڈیکارٹ خدا کے منکر تھے یا یہ چاہتے تھے کہ مادہ پرستانہ فکر انسانی ذہن میں اپنا گھر بنا لے۔

جیسا کہ ہم دیکھیں گے ہر سائنس داں خدا پرست ہے اور مذہب کے تقدس کو تسلیم کرتا ہے اس لئے یہاں کوئی تفریق نہیں خواہ "ہم ہوئے تم ہوئے کہ میر ہوئے" دراصل جو واقعہ ہے وہ صرف اتنا ہے کہ کلاسکی طبیعیات کے تصورات ہمیں اس عالم طبیعی کے بارے میں ایک خاص طرح پر سوچنے کے لئے مجبور کر دیتے ہیں۔ چنانچہ گلیلیو (Galileo) اور نیوٹن (Newton) نے جو تصورات ہمیں مادہ، زمان و مکان کے بارے میں دیئے وہ ان خصوصیات کے حامل ہیں:

---

۱ F.A. Lange : A history of Materialism : Routledge & Kegan Paul : London : 1957 .

۲ Erust Cassirer : The Goal and Method of Theoretical Physics ; in the Problem of knowledge : Yale Univ. Press: 1950 .

۱۔ مادہ ایک ٹھوس حقیقت ہے۔ اس لئے حواس ہمیں حقیقت تک پہنچا سکتے ہیں۔

۲۔ زمان و مکان ایک قطعی حقیقت ہیں یعنی ان میں مکمل قطعیت ہے۔ چنانچہ یہ نیوٹن کے یہاں ان کے الفاظ سے بالکل واضح ہے[1]

" The extension, hardness, impenetrability, mobility and vires inertiae of the whole, result from extension, hardness, impenetrability, mobility and vires inertiae of the parts and thence we conclude the least particles of all bodies to be also all extended, and hard, and impenetrable, and immovable and endowed with their proper vires inertiae. " (p. 232). (Principles, II , 161)

" Absolute, true, and mathematical time, of itself, and from its own nature, flows equably without regard to anything external .... ".
Absolute space, in its own nature, without regard to anything external remains always similar and immovable .... ". (p. 245)
(vide : Principles : 1, 6 , ff) .

" Absolute motion, is the transition of a body from one place to another ....". (p. 246).
" All motions may be accelerated and retarded, but the true, or equable progress of absolute time is liable to no change ." (p. 246).

کلاسکی طبیعیات کے ان تصورات کو دیکھنے کے بعد اس پر غور کرنا ہے کہ ان سے مادہ پرستانہ فکر کو کیا مدد ملی، یعنی وہ فکر جس نے آگے چل کر بیسویں صدی میں ایک جعلی اور مصنوعی سائنس کو جنم دیا۔ نیوٹن کی طبیعیات نے سب سے طاقتور تصور ہمیں (FORCE)

---

۱ E.A Burtt [Ibid] آئندہ بھی ایک ہی کتاب اور مصنف کا حوالہ اگر آیا تو اس کے لئے (Ibid) لکھا جائے گا۔

کا دیا جو آگے چل کر مادہ پرستانہ فکر نے پوری طرح استعمال کیا اور نفسیات میں اس کو ایک بالادستی بھی حاصل ہوئی۔ یہ تصور حرکت MOTION سے جڑا ہوا ہے جس کو پہلے تو نیوٹن نے اسے حرکت کا سبب قرار دیا بعد میں اس کو حرکت کی علت قرار دیا۔

نفسیات پر مادہ پرستانہ فکر کا زبردست اثر خصوصاً جون لوک JOHN LOCKE ڈیوڈ ہیوم DAVID HUME اور ٹامس ہوبز THOMAS HOBBES کی جانب سے آیا۔ جون لوک نے اپنی تحقیقات کا آغاز ایک ایسی زبانی بات چیت سے شروع کیا جو اس کے اور چند دوستوں کے درمیان ہو رہی تھی اور ہوتے ہوتے وہ ایک بحث کی شکل اختیار کر گئی۔ لوک کا تمام تر فکر اس بنیادی بات پر مرکوز ہے کہ ذہن یا شعور صرف حواس کی پیداوار ہے جو صرف مادی حقائق کی نمائندگی کرتے ہیں۔ شعور یا ذہن ایک کورا کاغذ ہے جس پر حواس کا قلم وہ سب کچھ لکھتا ہے جو خارجی ماحول میں ہے۔ یہ بات تو ٹھیک ہے اور ہمیں یہ افلاطون PLATO کے مکالمہ THAETETUS میں ملتی ہے جس سے لوک نے بہت کچھ لیا لیکن یہ بات اس لئے ادھوری ہے کہ اسی خارجی ماحول میں وہ حقائق بھی موجود ہیں جو SERIAL TIME سے تجاوز کر کے اپنا وجود رکھتے ہیں[1]

ڈیوڈ ہیوم[2] کے بارے میں ہر طالب علم یہ جانتا ہے کہ اس نے اسباب و علل کے روایتی

[1] John Locke : An Essay concerning Human Understanding : Henry Regnery Co. Chicago : 1956

S.T. John. Edition Vol : I pp: 205 - 206 خصوصاً دیکھئے :

اس پر ہم مدلل گفتگو آگے چل کر کریں گے۔

[2] David Hume : An Enquiry Concerning Human Understanding : Open Court Publishing Company : Chicago : 1927.

رشتے کو بھی توڑ ڈالا اور ذہن کو ایک تھیئٹر (THEATRE) قرار دیتے ہوئے یہ بتلانے کی کوشش کی کہ ذہن صرف مادی حقائق کی آمد و رفت کی ایک تماشہ گاہ ہے[1]

ڈیوڈ ہیوم کے فکر میں جو بات غیر معمولی اہمیت رکھتی ہے وہ یہ ہے کہ ہیوم وہ واحد مفکر ہے جس نے مادہ پرستانہ فکر کے لئے وہ مخصوص راستہ کھول دیا جس سے قرن ماضی میں وہ اپنے آخری منطقی عروج تک پہنچ گئی۔ یہ بات آگے چل کر واضح ہو جائے گی۔ یہاں صرف اتنا جاننا ضروری ہے کہ ہیوم نے اس غیر معمولی بات کو PERSONAL IDENTITY سے بحث کرتے ہوئے کہا ہے[2]۔ چنانچہ انسان کی ذاتی شخصیت یا تشخص غائب ہو کر صرف ایک قسم کا (NIHILISM) رہ جاتا ہے جو ایک نہایت ہی ہولناک ذہنی مزاج ہے جو ہر بے راہ روی کو گوارہ کر سکتا ہے۔

مغربی فکر کی اس رفتار کو ٹامس ہوبز (Thomas Hobbes) نے پہلے ہی بہت تیز کر دیا تھا۔ ہوبز نے ڈیکارٹ کو دوئی سے صرف (Res exteusa) یا خارجی حقائق کو لیا اور طبعیات سے حرکت کے تصور کو لے کر ہمیں یہ بتایا کہ ذہن کچھ نہیں ہے صرف ایک طبعی حرکت کا دوسرا نام ہے۔

ای۔ اے برٹ[3] اس طرح ہوبز کے الفاظ میں اس تصور کو پیش کرتا ہے۔

" Nothing exists then but particular objects in motion .... " [p. 128].

" Mind is organic motion, and sense is appearence of outness taking place really with in the organs. " [p. 132].

[1] David Hume (Ibid. p. 247)

[2] David Hume : [Ibid] Part IV; Section vi , Book 1 of Understanding pp 258 - 259.

[3] E A. Burtt (Ibid). p. 128 & p. 132 ..

اوپر یہ بتایا گیا تھا کہ سائنس کی عظیم ترین ہستیوں میں ہر شخص خدا پرست اور مذہبی تھا۔ چنانچہ کوپرنیکس Copernicus کیپلر (Kepler) گلیلیو (Galileo) بوئل (Boyle) گلبرٹ (Gilbert) نیوٹن (Newton) سبھی خدا پرست اور مذہب کے ماننے والے تھے۔ یہاں نیوٹن کے الفاظ خصوصاً خدا پر اس کے یقین کا احساس دلاتے ہیں، انداز کیجئے:

"Gravity may put the planets into niotion , but without the divine power it could never put them into such a circulating as they have about the seen." [1]

" God suffers nothing from the motion of bodies, bodies find no resistence from the ownnipotence of God ". [2]

ہم نہیں کہہ سکتے کہ نیوٹن کیا کہتے اگر وہ قرآن کی اس آیت کو دیکھ لیتے۔

"والسمٰوٰت مطویٰت بیمینہ" بہت بے چینی ہوتی ہے یہ سوچ کر کہ جلد سے جلد اس دور میں قرآن کا وہ فلسفہ سائنس مدون کر لیا جائے تو اس تہذیب کے نظام علم پر خط نسخ پھیر کر اس کے مکروہ اور انتہائی فاسقانہ نظام اقدار کو درہم برہم کر دے۔ یہ دیکھنے کے بعد یہ سوال پھر خود بخود اٹھتا ہے کہ مغربی فکر کے ارتقاء میں مادہ پرستانہ رجحان کی بالادستی آخر کس طرح ہوئی۔ اس سوال کا جواب دئے بغیر آگے بڑھنا اس لئے مناسب نہ ہوگا کہ پھر یہ مستقل ایک معمہ بن کر رہ جائے گا۔

غور کرنے پر دو اہم وجوہ سامنے آتے ہیں۔ ایک تو وہ کلاسکی طبیعیات جو خصوصاً نیوٹن کے تصورات کے اندر موجود تھے۔ اس کو اس دور کے شہرۂ آفاق ڈبلیو۔ ٹی۔ اسٹیس

[1] Opera IV 436 ff ; 439 Burtt [Ibid] p 291.

[2] Principles , II 311 Burtt [Ibid] p. 293

(W.T. STACE) [1] نے بہت شرح وبسط سے بیان کیا ہے۔ دوسرا سبب تاریخ فکر کے اس عمل میں ہے جو ناگزیر تھا۔ اسٹیس کا کہنا کہ نیوٹن کے تصور زمان، مکان، مادہ، کشش اور حرکت سے خدا کا صرف ایک تصور قائم ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ اس نے دنیا کو خلق کر کے دست برداری اختیار کر لی۔ یہ کائنات ایک مشین کی طرح خود بخود اپنا کام انجام دے رہی ہے۔ اس تصور کا نتیجہ یہ نکلا کہ خدا جس کو انسان اپنے سے بہت قریب دیکھنا اور تصور کرنا چاہتا ہے اتنا دور ہو گیا کہ اس تک دعا کو پہنچانا ہی ممکن نہ رہا۔ یوں کہئے کہ وہ انسان سے لاتعلق ہو گیا تو کائنات کے لئے صرف وہ مادی قوانین رہ گئے جن سے وہ چل سکے چنانچہ انسان بھی اپنے وجود کے اعتبار سے صرف مادی شے ہو کر رہ گیا۔ چنانچہ کائنات، نظام اسباب علل، انسان اور جملہ حقائق کے لئے خدا کو بیچ میں لانا ان کو سمجھنے کے لئے بالکل بے سود اور غیر ضروری تھا۔ سائنس کی ترقی کے ساتھ ساتھ یہ بات سامنے آتی چلی گئی قوانین قدرت (Laws of Nature) کی دریافت کے لئے جن باتوں کی ضرورت ہے ان میں خدا کا تصور ایک بے محل سی بات ہے۔ چنانچہ اس نے جتنا جتنا سائنس کو آگے بڑھایا وہ خدا کو دور کرتی چلی گئی اور اس کے تصور کو بے معنی کر کے رکھ دیا۔

مادہ پرستانہ فکر کے فروغ کا دوسرا اہم سبب مذہب و سائنس کی وہ کشمکش ہے جو کئی صدی تک ہونے کے بعد مذہب کی شکست پر ختم ہوئی [2] اس کشمکش کی داستان پڑھ کر رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں۔ یورپ میں غالباً ۲ لاکھ انسانوں کو زندہ جلا ڈالا گیا۔

[1] W.T. Stace : Religion and Modern Mind : Macmillan London : 1953

[2] Draper : Contlict Between Religion and Science

(اس وقت یہ کتاب ہمارے پاس موجود نہیں ہے۔ ہم معذرت خواہ ہیں کہ اس کا پورا حوالہ دینے سے قاصر ہیں)

کچھ کو سائنس کے الزام میں کچھ کو بلکہ بیشتر کو WITCH CRAFT کے الزام میں جس کا تعلق سحر اور تنتر وغیرہ سے تھا۔ مذہب کے خلاف ردعمل کا بنیادی سبب کلیسا تھا۔ کلیسا کی فرضی باتیں انجیل مقدس سے ملا دی گئی تھیں۔ یہ فرضی باتیں جب سائنس کے حقائق کے سامنے ایک ایک کرکے ٹوٹنا شروع ہوئیں تو وہ ظلم جو ہوتا چلا آرہا تھا بے تحاشہ بڑھ گیا۔ چنانچہ مذہب کے خلاف ردعمل بھی تیز ہوگیا۔ کلیسا کے قائم کردہ مذہب کو ختم ہونا ہی تھا۔ وہ ہوگیا۔ اٹھارویں انیسویں صدی میں مادہ پرستانہ فکر ایک غالب فکر کی حیثیت سے ایک Guiding Philosophy بن کر سامنے آیا۔ اس کو فرانس جرمنی اور انگلستان میں اس فکر کے ممتاز لوگوں نے اتنا آگے بڑھایا کہ اس کے تصورات مسلمات بنتے چلے گئے[1] فرانس میں French Encyclopaedists مثلاً لامیٹری (Law Mattrie) اور لاپلاس Laplace جرمنی میں نوگت (Voit) بخنر (Buehner) اور ہیکل (Haechel) اور انگلستان میں ہکسلے (Huxley) وغیرہ نے مادہ پرستانہ فکر کو غالب کردیا۔

انیسویں صدی میں ہمیں پھر یہ تماشہ دیکھنے کو ملتا ہے کہ ڈارون جو خدا کا قائل تھا اپنی کتاب اصل الانواع Origin of Species[2] کے بنا پر مادہ پرستانہ فکر کو آگے بڑھانے میں نمایاں کام انجام دے گیا۔ اپنی کتاب کو ختم کرتے وقت وہ یہ اعتراف کرتا ہے۔

" There is a grandure in this view of life , with its several powers,

[1] F.A. Lange : (Ibid)

[2] حوالہ اوپر دے دیا گیا

having been originally breathed by the Creator into a few forms or into one; and that , whilst this planet has gone cycling on according to the fixed law of gravity, from so simple a beginning endless forms most beautiful and most wonderful have been, and are being evolved. "
(p. 408)

Origin of Species : Watt & Co. London : 1948.

مادہ پرستانہ فکر نے اس دنیا کو، کائنات کو اور انسان کو اندھی طاقتوں کے سپرد کردیا، سب کو ایک بے مقصد حادثہ قرار دے دیا اور ڈارون کی تحقیقات نے جیسا کہ ہم نفسیات میں دیکھیں گے انسانی جسم کے نظام اور جانور کے نظام اجسام کے فرق کو اصولاً ختم کردیا۔ ان سب باتوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ انسان کا وجود اور اس کی زندگی قطعاً بے مقصد ہوکر رہ گئی ہے۔ اس بھیانک انجام کو ارتقا پر بحث کرتے ہوئے جی جی سمپسن (G. G. Suimpson) نے صراحت سے پیش کیا ہے[1]

پچھلے ڈیڑھ سو سال میں خصوصاً جس طرح سائنس اور ٹکنالوجی نے انسان کو اپنا غلام بنایا اور اس سے اس کی زندگی کا اصل مقصد چھینا ہے اس کی المناک داستان کچھ تو برٹرنڈ رسل[2] (Bertrand Russel) نے بیان کی ہے جو خود زندگی کو بے مقصد اور اندھی طاقتوں کا تماشہ مان چکے ہیں اور بڑی تفصیل سے اُسے لوئس ممفورڈ (Lewis Mumford)[3] نے بیان کیا ہے۔ رسل تو یہ سمجھ رہے ہیں کہ اس کرۂ ارض پر شاید انسانیت

[1] George Gaylord Simpson : The Meaning of Evolution : New American Library : New York : 1957 : p . 179 .

[2] The Impact of Science on Society : George Allen & Unwin : London 1952

[3] The Condition of Man : Martin Secker London : 1944

[4] Technics and Civilization : Harcourt Brace : New York : 1963.

نفسیات اکیسویں صدی میں

کا آخری دور ہے اور سائنس ہی اسے معدوم کرنے جارہی ہے۔ وہ مشین جس کی اس قدر توقیر کی جارہی ہے اس دور کا یعنی عصر جدید کا شیطان ہے جس کی عبادت ایک نئی طرز کی عفریت پرستی ہے۔ ممفورڈ نے اس شیطانی تہذیب کی تباہ کاریوں کا حال سینکڑوں صفحات پر بیان کرتے ہوئے یہ بتایا ہے:

" Modern Man has in fact painfully committing suicide. " (Page. 264)

ان کا خیال ہے اس مشین کو جو عذاب بن گئی ہے انسانیت کا جامہ پہنانا قطعاً ضروری ہے ورنہ انسانی سوسائٹی کے لئے یہ ایک شدید خطرہ ہے۔

انگلستان کے مشہور عالم الڈوس ہکسلے (Aldous Huxley) نے صاف صاف یہ بتایا ہے۔

اس سائنس نے جو تمام اخلاقی قیود و اقدار سے ہر طرح آزاد ہے انسان سے اس کی آزادی اور اس دنیا سے امن دونوں کو چھین لیا ہے[1]۔ وہ حکومت خواہ وہ کوئی بھی ہو جو پوری طرح اقتصادی اور سیاسی طاقت کو اپنے قبضے میں لے آئے گی اسی سائنس کا سہارا لے کر مظالم کرنے پر آمادہ ہو جائے گی۔

ان حقائق کو اچھی طرح جان لینے کے بعد ہمیں نفسیاتی اور عمرانی علوم میں ان کے اثرات کو دیکھنا ہے۔ قرن ماضی کے نصف اول تک یہ ایک مسلمہ تھا کہ نفسیات میں سائنٹفک تحقیق (Scientific Research) صرف اور صرف وہ ہے جو مشاہدہ، تجربہ، ناپ تول یعنی پیمائش (Measurement) پر مبنی ہے۔ چنانچہ نفسیات میں صرف

[1] Science, Liberty and Peace : Chatts & Windus : London : 1950

اور صرف وہ تصورات قابل قبول ہیں جن کی پیمائش ممکن ہے جن پر معمل میں تجربہ کیا جاسکتا ہے اور جن کو حواس کی گرفت میں لایا جاسکتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان صرف ایک مادی حقیقت ہے اور دیگر اجسام کے افعال کی طرح اس کے جسم کے افعال کام کررہے ہیں۔ کیونکہ وہ ایک جانور ہے۔ اس طرز فکر اور طریق کارکردگی کا منطقی اور علمی نتیجہ یہ تھا کہ نفسیات سے ہر اس تصور اور Concept کو نکال پھینکنا ضروری ہوگیا جو سائنٹفک تحقیقات کی شرائط پوری نہ کرسکے۔

نتیجہ اس سب کا یہ ہوا کہ نفسیات میں صرف وہ باتیں رہ گئیں جن کا تعلق حیاتیات اور عضویات سے تھا اور ان کو مزید سائنٹفک بنانے کے لئے ضروری ہوا کہ طبعیات اور کیمسٹری کے مقام پر لے آیا جائے جس کے لئے مصنوعی اصطلاحوں کا انبار لگادیا گیا مثلاً محبت کو Positive Valuence کہو نفرت کو Negative Valuence کہو۔ ٹھیک یہی وہ صورت حال ہے جو ایک مصنوعی اور جعلی سائنس کے فروغ کا باعث بنی۔

سائنٹزم کا فروغ | سائنٹزم کو خصوصاً تین راستوں سے فروغ حاصل ہوا (۱) حلقہ ویئینا Vienna Circle کا قیام (۲) کرداریت پسندانہ مکتب فکر کا قیام Behaviourusm (۳) تحلیل نفسی (Psychoanalysis)۔ Vienna Circle نے خصوصاً جدید فلسفہ سائنس کی بنیاد ایجابیت (Positivism) کے ان اصولوں کے تحت ڈالی جن کو فرانس میں آگسٹ کومٹے[1] (August Comte) نے مدون کیا تھا۔ جس کا یہ کہنا تھا ہر علم ترقی کرتے کرتے ناگزیر طور پر ریاضی کی شکل اختیار کرتا ہے اور کرے گا یعنی وہ فلسفہ نہیں سائنس ہوگا۔ حلقہ ویئینا کے ممتاز لوگوں نے جن میں

[1] Richard Von M Positivism Harvard Univ. Press 1951

وٹگنسٹائن (Wittgendtein) کارنیپ (Carnap) رائیکن باخ (Reichenbach) نیورتھ (Neurath) اور فائیگل (Feigl) نمائندگان تسلیم کئے جاتے ہیں انکا بیت کے اس تصور کو منطقی ایجابیت (Logical Positivism) میں ترقی دے کر یہ دعویٰ کیا کہ ہمیں صرف یہ دیکھنا ہے کوئی بھی تصور یا Concept کہاں تک تجزیہ کے ذریعہ ایسا بنایا جاسکتا ہے جس کا بیان منطقی زبان میں لاکر کیا جاسکے اور اس کے مختلف اجزا کے منطقی تعلق کو واضح کیا جاسکے۔[۱۱] دراصل یہ انداز فکر برٹرانڈ رسل اور فریگے (Frege) کی Analytical Philosophy سے آیا ہے جہاں ریاضی ایک منطق کی شکل میں سامنے آتی ہے۔ دوسرے اور تیسرے راستے یعنی کرداریت پسندانہ مکتب فکر اور تحلیل نفسی کا ذکر آگے چل کر آئے گا۔

نفسیات میں منطقی ایجابیت کے اثرات بڑی تیزی سے خصوصاً P.W BRIDGMAN کی شہرۂ آفاق کتاب[۱۶] The Logic of Modern Physics کے راستے سے آئے۔ برج مین کے اثر سے نفسیات کی ہر اصطلاح کی تعریف صرف OPERATIONAL طریقے

---

۱۰ H. FEIGL AND M. BRODBECK: READINGS IN THE PHILOSOPHY OF SCIENCE: APPLELOW-CAULONY-CROFTS. NEW YARK: 1953-

۱۱ May Brod beck : The Nature and Function of the Philosophy of Science [25 : Ibid].

۱۲ Rudolf Carnap : Testability and Meaning : [25 : Ibid]

۱۳ Herbert Feigl : The Mind Body Problem : [25 . Ibid]

۱۴ Haus Reichenbach : The Rise of Scientific Philosophy : Univ. of California Press : Los Angeles : 1951 .

۱۵ Otto Neurath The Philosophy of Viennense Circle : Monish 41,1931

۱۶ The Macmillon Co, New York . 1927.

سے کی جاسکتی تھی جس کو OPERATIONALISM کہا جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے نفسیات کا ہر ہر تصور اور اس سے وابستہ اصطلاحات وہ ہوں جن پر ہم معمل میں تجربہ کرسکیں، ٹھیک اسی طرح جو کیمسٹری یا طبعیات کے کسی معمل میں کرتے ہیں۔ ہر چیز یا تو نظر آئے۔ یا اس کے آثار نظر آئیں۔ یا پھر وہ استقرائی منطقی عمل سے اس طرح واضح ہو کہ اس میں اس نظر علم کی کوئی شبہہ نہ ہے جس کا ماخذ ٹھوس ہیں۔ ہم کو یہ معلوم کہ ہم اس میں کیا کیا تغیرات لاسکتے یعنی اس پر ہماری پوری پوری گرفت ہوئے دوسرے الفاظ میں وہ تمام باتیں جو اس طرح کی تعریف میں نہ لائی جاسکیں نفسیات سے خارج کردی جائیں۔ چنانچہ نفسیات کے ہر "مبہم تصور" کے لئے ضروری ہے کہ اس کو تجزیہ کے ذریعہ پیمائش کے طریقوں Methods of Measurement کی گرفت میں لایا جائے اس عمل کو REDUCTIONISM کہتے ہیں[۱۷]۔ یہ جب ہی ممکن اور آسان ہے جب کسی طرح نفسیاتی حقائق کو محض حیاتیاتی، عضویاتی یا طبیعی بنا دیا جائے۔ مثلاً تصور یا خیال کے بارے میں یہ کہا جائے کہ وہ صرف دماغ کے ایک مخصوص حصہ میں پیدا ہونے والی برقی حرکت ہے اور اس کو سمجھنے کے لئے ان کی EEG ریکارڈ کرلینا کافی ہے اس لئے تمام نفسیات حقائق صرف مادی ہیں۔ چنانچہ مادی کے علاوہ ان کی ہر توجیہ غلط ہے۔ مادی توجیہات کی جو زبان ہے وہ بھی مخصوص ہے جس کا ہر CONCEPT ایسا ہونا چاہئے جس کی پیمائش آلات سے ہوسکے اور اس طور پر تحقیقات کرنے کو اور پیمائش، تجربات اور ان کے آلات کے استعمال کو OBJECTIVE METHOD کہا

---

(۱۷) Abraham Kaplan The Condoct of Inquiry : Chandler Publishing Co Sanfrancisco. 1964.

گیا ہے۔ ان تمام باتوں کے پیچھے جو جذبہ کام کر رہا تھا وہ یہ تھا کہ جس طرح بھی ہو نفسیاتی علم کو تحقیق کے میدان میں وہی مقام دیا جائے جو طبیعی علوم کا ہے۔ اس بات سے نفسیات کا "علمی وقار" بڑھے گا اور ہم "سائنس داں" کہلائیں گے۔ نفسیات کو طبیعی علوم کی صف میں لانا اس لئے بھی قطعاً ناگزیر ہے کہ انسان بھی دیگر چیزوں کی طرح ایک مادی شے (THING) ہے۔ مادہ پرستانہ فلسفہ یہی سکھاتا ہے۔ چنانچہ نفسیاتی علم سے ہر اس تصور کو خارج کر دینا قطعاً ضروری ہے جس سے کسی بھی غیر مادی بات کی طرف ذرا سا اشارہ بھی ملتا ہو۔ اس لئے ایسی "مہمل" باتیں مثلاً روح، شعور، ذہن، لطیف احساسات، روحانی کردار، دھرم، وقار اور اس طرح کی اور تمام باتیں وہ ہیں جن کو "سائنٹفک نفسیات" کے میدان سے باہر نکال دینا ضروری اور ان پر کسی قسم کی گفتگو یا مباحثہ بکواس سمجھی جائے۔

یہ ہے وہ سائنٹزم جو "ماہرین نفسیات" کا طرۂ امتیاز ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کا فروغ صرف مادہ پرستانہ فکر کی بالادستی، منطقیانہ، تجزیاتی اور پیمائشی طریقوں سے ہی ممکن تھا۔ قرن ماضی میں اور خصوصاً اس کے پہلے نصف حصہ میں جن باتوں نے SCIENTISM کی آبیاری کی وہ یہ ہیں۔

LOGICAL EMPIRICISM ، LOGICAL POSITIVISM ، PHYSICALISM.
OPERATIONISM ، OBJECTIVISM، REDUCTIONISM ہے۔[۱-۲]

۱۔ Robert C. Stanffer [ed.] Science and Civilization; University of Wiscorsin Press : 1949.

۲۔ The International Encyclopaedia of Unified Science : Univ. of Chicago Press : 1944.

قرن ماضی کے دوسرے نصف حصہ میں ڈارون کے اثرات نے نفسیاتی علم کے لئے یہ ضروری قرار دے دیا کہ نفسیاتی قوانین کا سراغ ہمیں جانوروں پر تجربہ کر کے مل سکتا ہے جس کے لئے تحقیقات کا ایک نیا دروازہ کھل گیا۔ یہیں BEHAVIOURISMTic مکتب فکر کی ایک نہایت وسیع اور عریض عمارت میں لے جاتا ہے۔ چنانچہ نفسیات میں جس مکتب فکر نے سائنٹزم کو پوری طرح فروغ دیا وہ یہی BEHAVIOURISM یا کرداریت پسندانہ "مکتب فکر" ہے۔ اس کے علاوہ سائنٹزم نے پیمائشی نفسیات کے میدان میں پورا پورا فروغ حاصل کیا جس کا اصل الاصول یہ ہے کہ انسان کی ہر ہر بات کو ناپو اور تولو، عقل کو، فکری دسترس کو، احساسات کو، مزاج کو، رجحانات کو اس کے اندرون کو، شعور کو اگر وہ مان ہی لیا جائے تو اس کی ہر حرکت اور کیفیت کو، یہی نہیں بلکہ انسان کی اچھی طرح ناپ تول کر کے اور اس ناپ تول کو بھی خوب ٹھونک بجا کر انسان کے بارے یا اس کی قسمت کے بارے میں رائے قائم کرو، ہو سکے تو پیشین گوئی PREDICTION بھی کرو اور ان تمام باتوں کے لئے قانونی اختیارات بھی حاصل کر لو تاکہ "سائنٹفک نفسیات" کو آگے بڑھنے میں کوئی دقت نہ ہو۔ تمام مالی ذرائع (FUNDS) پر قبضہ کر لو اور ساتھ ہی ساتھ اشاعتی ذرائع کو بھی پوری طرح اپنی تحویل میں لے لو تاکہ نفسیاتی علم کے میدان میں کبھی بھی ایسی کھوکھلی اور لغو باتیں شایع نہ ہوں جیسے روحانی کردار، انسانی وقار، انسانی آزادی، شرافت، داخلی کیفیات، پاکی نفس، اور چونکہ ایسی "لغو باتوں" کی فہرست بہت طویل ہے اس لئے اس سے قطع نظر کر کے صرف یہ دیکھو اور دکھاؤ کہ کون سی بات، کون سا تصور اور کون سا لفظ یا اصطلاح وہ ہے جو پیمائش کے قابل ہے اور جس کے لئے ایک نہایت ہی قابل ستایش نفسیاتی سائنس داں اعلیٰ درجے کے ٹسٹ

TESTS بنا سکتا ہے جو بازار میں اچھی طرح اور اعلیٰ قیمت پر بک سکیں۔ کیونکہ یہ Tests ہی اب طے کریں گے کہ کون کیا ہے، کیسا ہے، کس مقام پر ہے اور کس طرح استعمال کیا جا سکتا ہے۔

یہ ہے سائنٹزم کے فروغ کی معراج

سائنٹزم کے نتائج سائنٹزم ہمارے نزدیک انسان دشمن تہذیب کا وہ زہریلا عقیدہ ہے جس نے آج اس سائنس اور ٹکنالوجی کو وہ ٹھوس اسلحہ فراہم کر دئے ہیں جو ہمارے سامنے ایک فرشتۂ اجل بنے کھڑے ہیں۔ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ انسان کو بچانے کے لئے اور اس کے مسکن کو بچانے کے لئے جسے کرۂ ارض کہتے ہیں اس مکروہ اور زہریلی تہذیب کو ایک سرے سے دوسرے تک کھنڈر بنا دینا ضروری ہے۔ جس کے لئے فوراً اب یہ ضروری ہے کہ اس کے اس زہریلے، جھوٹے اور مصنوعی علم کا خاتمہ کر دیا جائے جس کے سہارے سے یہ قائم ہے۔ یہ خاتمہ اس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک اس نظریہ علم، نظریہ حقیقت اور نظریہ اقدار کو سامنے نہ لایا جائے جو اس فلسفہ سائنس کی توثیق کر سکتا ہے جس کا ماخذ ربانی کلام ہے۔ چنانچہ اس پر گفتگو کرنے سے پہلے ہم یہ دیکھیں گے کہ اس سائنٹزم کے کیا نتائج برآمد ہوئے جس نے انسان دشمن تہذیب کو وجود میں لا کر اسے انسان کا قاتل بنا دیا اور اسے اس کے مقام سے گرا دیا اور انسانیت کو بربریت میں بدل دیا۔ سائنٹزم کا سب سے پہلا نتیجہ تو یہ تھا کہ نفسیاتی حقائق کو Reductionism کے تحت زبردستی ان اصطلاحوں کا جامہ پہنانے کے لئے، جو بالکل تنگ اور بے کار تھا پے در پے اور بری طرح توڑا مروڑا گیا۔ ایک مصنوعی زبان یہ کہہ کر اختراع کی گئی کہ یہ سائنس کی زبان ہے۔ ساری باتیں اسی زبان میں لائی جائیں گی۔

اس کا دوسرا نتیجہ یہ نکلا کہ علم کے وہ تمام دروازے بند کر دئے گئے جو انسانی فطرت کے ان پہلوؤں کو جاننے کے لئے ضروری ہیں جن کو SUBJECTIVE کہتے ہیں۔ کیونکہ یہ طے پا گیا تھا کہ ایسی باتیں جیسے خلوص، محبت، ایثار، دیانت داری، رحم، ہمدردی، اعلیٰ ظرفی، وفا، عظمت، استقامت وغیرہ سائنس کے لئے قطعاً بے کار ہیں اور ایسے طریقے جیسے خود شناسی، احتساب نفس، مراقبہ، شعور کے وجدانی راستے اور اس کی وجدانی کیفیات یا اندرونی خود بینی مثلاً Introspection ممنوع قرار دئے گئے۔

اس انداز فکر کے پیچھے دراصل ایک ایسا مفروضہ کام کر رہا تھا جو ایک عقیدہ بن گیا تھا اور وہ یہ تھا کہ طبیعی علوم کو نفسیاتی اور عمرانی علوم پر ایک ایسی فوقیت حاصل ہے جس کی بنا پر ان کی بالادستی مسلم ہے۔ چنانچہ نظریات اور طریق کار و تحقیقات کے اعتبار سے صرف انہی کو اولیت حاصل ہونا چاہئے۔ اس لئے نفسیاتی و عمرانی علوم میں صرف وہی طریق تحقیق صحیح ہوگا جو طبیعی علوم میں استعمال ہوتا ہے۔ یعنی تجربہ، پیمائش اور اعداد سے ان کا اظہار اور جس کو ہم Axiomitization کے تحت لا سکیں۔ یہ وہ صورت حال تھی اور ہے جس سے علم کا توازن ہی درہم برہم ہو گیا اور یہی وہ بات ہے جو علمی بحران کی شکل اختیار کر گئی ہے۔ جس کے سبب آج ٹکنالوجی موت کا پیغام دے رہی ہے۔ اس توازن کو دوبارہ لانے کے لئے قرآن کے فلسفہ سائنس کو Systematic طور پر سامنے لانا ہوگا۔ قرآن ہم کو اس دور میں ایک Synthesis of Knowledge عطا کرے گا یہی وہ Synthesis of Knowledge ہے جس کے ذریعہ دوئی کا خاتمہ ہو کر وہ راستہ کھلتا ہے جہاں سے ایک ہمہ گیر وحدت کی طرف انسانی فکر موڑے سکے گا اور ٹھیک یہی وہ موڑ ہے جس کے آگے وحدت انسان کا وہ سنگ میل نظر آنے لگتا ہے جس تک پہنچ

جانے کے بعد ہم کو وہ کلمہ سوا مل جاتا ہے جس کے تحت بلا امتیاز رنگ و نسل، ملک و ملت اور مذہب و عقیدہ انسانیت جمع ہو سکے گی۔ اگر اس صدی میں یہ نہ ہو سکا تو دوسرا امکان اظہر من الشمس ہے۔

اس لئے عصر جدید کے انسان کو (MODERN MAN) یہ بتانے کی اب فوری ضرورت ہے کہ ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ" اس کا دوسرا نتیجہ یہ نکلا کہ ٹسٹ بنانے کا ایک سیلاب آگیا جو انسان کے بارے میں معقول سے معقول بات کو بھی فضول اور بے معنی بنانے لگا۔ ٹسٹ سازی (TEST CONSTRUCTION) کی یہ وبا اس حد تک بڑھی کہ بالآخر اس نے اپنا رشتہ بازاری تہذیب سے باقاعدہ طور پر جوڑ کر بازاریت پسندانہ مزاج اور شخصیت کی کھوکھلی اور بے معنی "علمی ترقیات" کے لئے ایک راستہ کھول دیا۔ ٹسٹ بناؤ اور خوب پیسہ کماؤ۔ اس ذہنیت نے جس طرح انسان کی توہین کی ہے اس پر ہم نے بحث کرتے ہوئے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ایک موقر جریدہ "فکر و نظر" میں ۱۹۷۶ء میں (یا غالباً ۱۹۶۸ء)[1] ڈاکٹر ایرک فروم کے ان خیالات کو پیش کیا تھا جو ان کی ان تحقیقات پر مبنی ہیں جو انہوں نے معالجاتی نفسیات کے میدان میں کی ہیں۔ ڈاکٹر ایرک فروم نو فرائیڈی اسکول NEO FREUDIAN SCHOOL کے چوٹی کے منکرین میں ہیں۔

(باقی)

---

[1] میرے پاس اس وقت اس تحقیقی مقالے کا صرف REPRINT ہے "فکر و نظر" رسالے کا FRONTPAGE موجود نہیں ہے۔ اس لئے قطعی طور پر نہیں بتا سکتے کہ یہ کس شمارہ نمبر میں تھا۔

الفاروق ایک مطالعہ

از ضیاء الدین اصلاحی

(۲)

عراق عجم کی بڑی مہم میں سپہ سالار کا مسئلہ اٹھا، لوگوں کو اس درجہ کا کوئی شخص نظر نہیں آتا تھا، جو لوگ اس منصب کے قابل تھے وہ اور اور مہمات میں مصروف تھے اس موقع پر حضرت عمرؓ کے انتخاب کی تحسین مولانا نے اس طرح کی:

"حضرت عمرؓ کے مراتب کمال میں یہ بات بھی داخل ہے کہ انہوں نے ملک کے حالات سے ایسی واقفیت حاصل کی تھی کہ قوم کے ایک ایک فرد کے اوصاف ان کی نگاہ میں تھے چنانچہ اس موقع پر حاضرین نے خود کہا کہ اس کا فیصلہ آپ سے بڑھ کر کون کر سکتا ہے" حضرت عمرؓ نے نعمان بن مقرن کو انتخاب کیا اور سب نے اس کی تائید کی"[1]

فتوحات کے تذکرے میں کہیں کہیں اسلامی نظریۂ جنگ پر بھی روشنی ڈالی ہے مثلاً عراق عجم کے ضمن میں یزدگرد کی فوجوں سے نہاوند میں معرکہ آرائی کے بعد عام لشکر کشی کے آغاز ہی میں لکھتے ہیں:

"اس وقت تک حضرت عمرؓ نے ایران کی عام تسخیر کا ارادہ نہیں کیا تھا، اب تک جو لڑائیاں

---

[1] مولانا شبلی نعمانی۔ الفاروق حصہ اول ص ۱۰۲، معارف پریس اعظم گڑھ ۱۹۵۶ء / ۱۳۷۶ھ۔

ہوئیں وہ صرف اپنے ملک کی حفاظت کے لیے تھیں، عراق البتہ ممالک محروسہ میں اضافہ کر لیا گیا تھا لیکن وہ درحقیقت عرب کا ایک حصہ تھا، کیونکہ اسلام سے پہلے اس کے ہر حصہ میں عرب آباد تھے، عراق سے آگے بڑھ کر جو لڑائیاں ہوئیں وہ عراق کے سلسلہ میں خود بخود پیدا ہوتی گئیں، حضرت عمرؓ خود فرمایا کرتے تھے کہ کاش ہمارے اور فارس کے بیچ میں آگ کا پہاڑ ہوتا کہ نہ وہ ہم پر حملہ کر سکتے نہ ہم ان پر چڑھ کر جا سکتے۔ لیکن ایرانیوں کو کسی طرح چین نہیں آتا تھا، وہ ہمیشہ نئی فوجیں تیار کر کے مقابلے پر آتے تھے اور جو ممالک مسلمانوں کے قبضے میں آچکے تھے وہاں غدر کروا دیا کرتے تھے، نہاوند کے معرکے سے حضرت عمرؓ کو اس پر خیال ہوا اور اکابر صحابہ کو بلا کر پوچھا کہ ممالک مفتوحہ میں بار بار بغاوت کیوں ہو جاتی ہے، لوگوں نے کہا جب تک یزدگرد ایران کی حدود سے نہ نکل جائے، یہ فتنہ فرو نہیں ہو سکتا، کیونکہ جب تک ایرانیوں کو خیال رہے گا کہ تخت کیان کا وارث موجود ہے اس وقت تک ان کی امیدیں منقطع نہیں ہو سکتیں، اس بنا پر حضرت عمرؓ نے عام لشکر کشی کا ارادہ کیا۔"[1]

آگے خراسان کی فتح اور یزدگرد کی ہزیمت کے زیر عنوان لکھا:

"حضرت عمرؓ فتوحات کی وسعت کو چنداں پسند نہیں کرتے تھے، خط پڑھ کر فرمایا کہ ہمارے اور خراسان کے بیچ میں آگ کا دریا حائل ہوتا تو خوب ہوتا۔"[2]

احنف جن کو خراسان کا علم ہوا تھا کے مردانہ حوصلوں کی بڑی تعریف کی اور فرمایا کہ احنف شرقیوں کا سرتاج ہے تاہم جواب میں جو نامہ لکھا اس میں لکھا کہ جہاں تک پہنچ چکے ہو وہاں سے آگے نہ بڑھنا، اس سلسلے کا خاتمہ اس عبرت انگیز اور موثر تحریر پر کیا۔ احنف کا نامہ فتح

[1] مولانا شبلی نعمانی، الفاروق حصہ دوم، ص ۱۸۶، معارف پریس اعظم گڑھ ۱۹۵۶ء / ۱۳۷۶ھ۔ [2] ایضاً ص ۱۸۷

پاکر کے حضرت عمرؓ نے تمام آدمیوں کو مژدہ فتح سنایا اور ایک پر اثر تقریر کی، آخر میں فرمایا:

"آج مجوسیوں کی سلطنت برباد ہو گئی اور اب وہ اسلام کو کسی طرح ضرر نہیں پہنچا سکتے، لیکن اگر تم بھی راست کرداری پر ثابت قدم نہ رہے تو خدا تم سے بھی حکومت چھین کر دوسروں کے ہاتھ میں دے دے گا۔"[1]

شام کی فتوحات اور ۱۷ھ کے واقعات میں حضرت خالد جیسے عظیم الشان سپہ سالارؓ کا معزول کیا جانا بڑا اہم واقعہ ہے مگر حضرت عمرؓ پر طعن و تشنیع کرنے کے لئے اس میں بڑی رنگ آمیزی کی گئی جس کی اصل حقیقت مولانا کے حقیقت نگار قلم نے اس طرح واضح کی ہے، وہ عام مورخین کے اس بیان کو غلط قرار دیتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے عنان خلافت ہاتھ میں لینے کے ساتھ پہلا جو حکم دیا وہ حضرت خالد کی معزولی تھی، انہوں نے اس میں ابن اثیر پر اختلاف بیانی کا الزام بھی لگایا ہے کہ خود ۱۳ھ کے واقعات میں خالد کا معزول ہونا لکھا ہے اور خود ہی ۱۷ھ کے واقعات میں ان کی معزولی کا الگ عنوان قائم کیا ہے اور دونوں جگہ ایک سے واقعات نقل کر دئے ہیں۔

مولانا شبلیؒ نے واقعہ کی یہ تفصیل لکھی ہے۔

حضرت عمرؓ حضرت خالدؓ کی بعض بے اعتدالیوں کی وجہ سے مدت سے ناراض تھے۔ تاہم آغاز خلافت میں ان سے کچھ تعرض کرنا نہیں چاہا، لیکن چونکہ خالدؓ کی عادت تھی کہ وہ کاغذات حساب دربار خلافت کو نہیں بھیجتے تھے، حضرت عمرؓ کی تاکید پر انہوں نے جواب لکھا کہ میں حضرت ابوبکرؓ کے زمانے سے ایسا ہی کرتا آیا ہوں اور اب اس کے خلاف نہیں کر سکتا۔ حضرت عمرؓ کو ان کی یہ خود مختاری کیونکر پسند آ سکتی تھی اور وہ بیت المال کی رقم کو اس طرح بے دریغ کیونکر کسی کے

[1] مولانا شبلی نعمانی، الفاروق حصہ دوم ص ۱۸۷، معارف پریس اعظم گڑھ ۱۹۵۶ء / ۱۳۷۶ھ۔

ہاتھ میں دے سکتے تھے، چنانچہ حضرت خالد کو لکھا کہ تم اسی شرط پر سپہ سالار رہ سکتے ہو کہ فوج کے مصارف کا حساب ہمیشہ بھیجتے رہو، انہوں نے اس شرط کو نامنظور کر دیا اس بنا پر وہ سپہ سالاری کے عہدے سے معزول کر دئے گئے، چنانچہ اس واقعہ کو حافظ ابن حجر نے کتاب الاصابہ میں حضرت خالد کے حال میں بہ تفصیل لکھا ہے[۱]۔ مولانا کا بیان ہے باایں ہمہ ان کو بالکل معزول نہیں کیا بلکہ ابو عبیدہ کے ماتحت کر دیا۔ اس کے بعد ۱۷ھ میں انہوں نے ایک شاعر کو دس ہزار روپے انعام میں دے دئے، حضرت عمرؓ کو اطلاع ہوئی تو انہوں نے ابو عبیدہؓ کو خط لکھا کہ اگر انہوں نے اپنی گرہ سے دیا تو اسراف کیا اور بیت المال سے دیا تو خیانت کی، دونوں صورتوں میں وہ معزولی کے قابل ہیں۔

حضرت خالد کی معزولی کی کیفیت یہ تحریر کی ہے کہ معزولی کا خط لے جانے والے قاصد نے مجمع عام میں ان سے پوچھا یہ انعام تم نے کہاں سے دیا، حضرت عمرؓ کا حکم تھا کہ اگر اپنی خطا کا اقرار کر لیں تو ان سے درگذر کی جائے، لیکن وہ اپنی خطا کے اقرار کرنے پر راضی نہ تھے، مجبوراً قاصد نے معزولی کی علامت کے طور پر ان کے سر سے ٹوپی اتار دی اور ان کی سرتابی کی سزا کے لئے انہی کے عمامہ سے ان کی گردن باندھی، اس کیفیت پر مولانا کا تاثر ملاحظہ ہو:

"یہ واقعہ کچھ کم حیرت انگیز نہیں کہ ایک ایسا بڑا سپہ سالار جس کا نظیر تمام اسلام میں کوئی شخص موجود نہ تھا اور جس کی تلوار نے عراق و شام کا فیصلہ کر دیا تھا، اس طرح ذلیل کیا جا رہا ہے اور مطلق دم نہیں مارتا، اس واقعہ سے ایک طرف تو حضرت خالد کی نیک نفسی اور حق پرستی کی شہادت ملتی ہے اور دوسری طرف حضرت عمرؓ کی سطوت و جلال کا اندازہ ہوتا ہے"[۲]

[۱] مولانا شبلی نعمانی، الفاروق حصہ اول ص ۱۵۰، معارف پریس اعظم گڑھ ۱۹۵۶ء/۱۳۷۶ھ [۲] ایضاً ص ۱۵۱۔

امام ابو یوسف کی کتاب الخراج اور تاریخ طبری سے یہ بھی لکھا کہ "حضرت خالد نے حمص کی ایک تقریر میں کہا کہ امیر المومنین نے مجھ کو شام کا افسر مقرر کیا جب میں نے اس کو زیر کر لیا تو مجھ کو معزول کر دیا، ایک سپاہی نے کہا سردار چپ رہ! ان باتوں سے فتنہ پیدا ہو سکتا ہے، حضرت خالدؓ نے کہا حضرت عمرؓ کے ہوتے فتنہ کا کیا احتمال ہے[۱]

حضرت خالدؓ مدینہ آئے تو حضرت عمرؓ سے کہا بخدا آپ میرے معاملہ میں ناانصافی کرتے ہیں، حضرت عمرؓ نے کہا تمہارے پاس اتنی دولت کہاں سے آئی، کہا مال غنیمت سے اور یہ کہہ کر کہا کہ ساٹھ ہزار سے جس قدر زیادہ رقم نکلے وہ میں آپ کے حوالے کرتا ہوں، چنانچہ بیس ہزار زیادہ نکلی اور وہ بیت المال میں داخل کر دی گئی، حضرت خالدؓ سے حضرت عمرؓ نے کہا واللہ تم مجھ کو محبوب بھی ہو اور میں تمہاری عزت بھی کرتا ہوں، عمالان ملکی کو لکھا کہ میں نے خالدؓ کو ناراضی سے یا خیانت کی بنا پر موقوف نہیں کیا لیکن میں یہ دیکھتا تھا کہ لوگ ان کے مفتون ہوتے جاتے ہیں، اس لئے میں نے ان کو معزول کرنا مناسب سمجھا تاکہ لوگ یہ سمجھیں کہ جو کچھ کرتا ہے خدا کرتا ہے[۲]۔

عہد فاروقی میں فتوحات مکران پر ختم ہوئیں یا سندھ میں دیبل اور تھانہ تک پہنچ گئی تھیں، طبری کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اخیر حد مکران ہے، بلاذری کا بیان ہے کہ دیبل کے نشیبی حصہ اور تھانہ تک فوجیں آئیں۔

مولانا شبلی دونوں اقوال میں کوئی ترجیح نہیں دے سکے، وہ بلاذری کا بیان نقل کر کے یہ لکھتے ہیں:

"اگر یہ صحیح ہے تو حضرت عمرؓ کے عہد میں اسلام کا قدم سندھ ہند میں آ چکا تھا"[۳]

[۱] مولانا شبلی نعمانی، الفاروق حصہ اول ص ۱۵۱، معارف پریس اعظم گڑھ ۱۹۵۶ء/۱۳۷۶ھ [۲] ایضاً ص ۱۵۲ [۳] ایضاً ص ۱۸۳۔

بعد کے مورخین نے بلاذری کے بیان کو ترجیح دی ہے۔

مولانا شبلی کے زمانے میں الفاروق کے جو اڈیشن نکلے، اس کے حصہ اول و حصہ دوم کے مابین دنیائے اسلام کا ایک نقشہ بھی شامل تھا، شروع میں دار المصنفین سے شایع ہونے والے نسخوں میں بھی یہ نقشہ شامل تھا، پھر پتہ نہیں کیسے غائب ہوگیا، چند برس پہلے اس کا عکسی اڈیشن شایع کرنے کے وقت راقم نے بہت چاہا کہ نقشے والا کوئی نسخہ مل جائے تو اس کو شامل کردیا جائے مگر کامیابی نہیں ہوئی۔

یہ نقشہ جرمنی کے پروفیسروں نے مرتب کیا تھا، ان کی جانفشانی اور دقیقہ سنجی کو لایق ہزار آفریں کہتے ہوئے نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمن خان شروانی نے لکھا:

"اس نقشہ میں کھاری پانی کے سمندروں سے گزر کر فتوحات اسلامیہ کے جاں فزا سمندر موجزن ہیں اور جس طرح دنیا کے سمندروں میں رنگ کا امتیاز ہے۔ کوئی اسود ہے، کوئی احمر۔ اسی طرح اس نقشہ میں مختلف عہد کے فتوحات کے سیلاب اپنے اپنے رنگ سے ممتاز نظر آتے ہیں اور ایک نگاہ میں حضرت سرور عالمؐ خلیفہ اول سے ثالث تک اور بنی امیہ کے عہد اور اس کے مابعد کی فتوحات کی حد معلوم ہوجاتی ہے، اس نقشہ کی مدد سے عرب کی گذشتہ تاریخ عمدہ طور پر سمجھ میں آسکتی ہے، شمس العلما سید علی بلگرامی نے بھی ایک نقشہ "تمدن عرب" میں شامل اس کے دیا ہے، لیکن الفاروق کا نقشہ اس سے زائد مفید اور زیادہ معلومات کا مخزن ہے، کاش یہ نقشہ بڑا چھاپ کر دیوار کے آویزاں کرنے کے لایق بنایا جائے۔"[1]

اب ہم حصہ دوم کا تجزیہ کرکے اس کے اہم مطالب و مباحث پر نظر ڈالیں گے۔ اس

[1] مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی، مقالات شروانی ص ۳۰، شروانی پرنٹنگ پریس علی گڑھ، ۱۹۴۴ء۔

حصے میں حضرت فاروق اعظم کے ملکی اور مذہبی انتظامات اور علمی کمالات اور ذاتی اخلاق اور عادات کی تفصیل ہے، اس کے متعلق مصنف کا یہ دعویٰ بے جا نہیں کہ ان کی سعی و محنت کی تماشا گاہ ہے، واقعتاً انھوں نے اس میں حضرت فاروق کی عظمت کی پوری تصویر کھینچ دی ہے۔

مولانا شروانی رقم طراز ہیں:

"کوئی حصہ ثانی کی فہرست مطالب دیکھے تو سمجھے گا کہ کسی انیسویں صدی کی مہذب و منتظم سلطنت کے محکموں کی فہرست ہے، کیا یہ کم تعجب خیز امر ہے کہ شائستگی نے جو وسعت حکومت کے مفہوم میں آج پیدا کی ہے اور اسی وسعت کی بنا پر جو جو محکمے جز و سلطنت قرار پائے ہیں وہ سب نہیں تو ان میں سے اکثر منتظم شکل میں حضرت عمرؓ نے اپنی دہ سالہ حکومت میں قائم فرما دئے تھے اور نہ صرف قائم فرمائے بلکہ ان کے فیض بخش نتائج عالم کو دکھا دئے۔

علامہ مصنف کو سب سے اول ان کی قوت دماغی اور جامعیت خیال پر آفریں کہنی چاہئے کہ انھوں نے فاروق اعظم کی لائف کا ایسا وسیع اور جامع خاکہ اپنے ذہن میں قائم کیا، یا بہ الفاظ دیگر ان کی عظمت کو اصلی ہیئت میں دیکھا، اس کے بعد مصنف کی تلاش و تجسس کی داد دینی چاہئے کہ جس قدر عنوان قائم کئے ان کو پوری نکتہ سنجی اور موشگافی کے ساتھ معمور کیا اور واقعات کی مدد سے ہر بحث کا حق ادا کردیا۔"[1]

سب سے پہلے اس حصے کے عنوانات ملاحظہ فرمائیں!

فتوحات پر ایک اجمالی نگاہ (ص ۳۲ تا ۱۰۱)، نظام حکومت (ص ۱۰۱ تا ۲۰۰)، ملک کی تقسیم صوبہ جات اور اضلاع، عہدہ داران ملکی (ص ۲۰۱ تا ۲۳۶)، صیغہ محاصل (خراج) (ص ۲۳۷ تا ۲۵۳)، صیغہ عدالت

[1] مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی، مقالات شروانی ص ۳۸، شروانی پرنٹنگ پریس علی گڑھ، ۱۹۴۴ء۔

(ص ۵۴-۶۲) افتا (ص ۶۳ تا ۶۵) فوج داری اور پولیس (ص ۶۶ و ۶۷) بیت المال یا خزانہ (ص ۶۸ تا ۷۰) پبلک ورکس (نظارت نافعہ) (ص ۷۱ تا ۷۶) شہروں کا آباد کرنا (ص ۷۷ تا ۸۴) صیغہ فوج (ص ۸۵ تا ۱۰۸) صیغہ تعلیم (ص ۱۰۹) صیغہ مذہبی (ص ۱۱۰-۱۲۹) متفرق انتظامات (ص ۱۳۰ تا ۱۳۴) ذمی رعایا کے حقوق (ص ۱۳۵ تا ۱۵۴) غلامی کا رواج کم کرنا (ص ۱۵۵ تا ۱۶۱) سیاست و تدبیر عدل و انصاف (ص ۱۶۲ تا ۱۸۹) امامت اور اجتہاد (ص ۱۹۰ تا ۲۴۰) ذاتی حالات اور اخلاق و عادات (ص ۲۴۱ تا ۲۷۷) اولیات (ص ۲۷۷ تا ۲۸۰) ازواج و اولاد (ص ۲۸۱ تا ۲۸۵) خاتمہ (ص ۲۸۶ تا ۲۹۱)

پہلے عنوان کے تحت فتوحات فاروقی کی وسعت، حدود اربعہ اور کل رقبہ اور یہ بتایا ہے کہ اس میں کون کون ممالک تھے پھر فتوحات کے وہ اسباب بیان کئے ہیں جو یورپین مورخین نے دکھائے ہیں کہ اس وقت فارس و روم کی سلطنتیں اوج اقبال سے گزر چکی تھیں، فارس کا نظام سلطنت درہم برہم تھا، حکومت سنبھالنے والے اہل اور لائق اشخاص نہ تھے ارکان سلطنت میں سازشیں ہوگئی تھیں، مزدکیہ فرقہ کا زور تھا، اسلام مذہب و عقیدہ سے تعرض نہ کرتا تھا، عیسائی فرقے ان کے معین ہو گئے تھے، روم کی سلطنت بھی کمزور ہوگئی تھی اور عیسائیت کے باہمی اختلافات زوروں پر تھے۔ مولانا کے نزدیک واقعیت سے خالی نہ ہونے کے باوجود یہ جواب طرز استدلال کی ملمع سازی ہے، سلطنتوں کی کمزوری کا نتیجہ یہ ہو سکتا تھا کہ وہ پُرزور قومی سلطنت کا مقابلہ نہ کر سکتیں نہ یہ کہ عرب جیسی بے سروسامان قوم سے ٹکرا کر پرزے پرزے ہو جاتیں۔ ان کے نزدیک اصل سبب یہ تھا:

"مسلمانوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بدولت جو جوش، عزم، استقلال، ہمت، بلند حوصلگی، دلیری پیدا ہوگئی تھی اور جس کو حضرت عمرؓ نے اور زیادہ قوی اور تیز

کر دیا تھا، روم و ایران کی سلطنتیں عین عروج کے زمانے میں بھی اس کی ٹکر اٹھا نہیں سکتی تھیں۔"[1]

پھر وہ ان باتوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں جنھوں نے قیام حکومت میں مدد دی اور جن میں سب سے مقدم دیانت داری اور راست بازی تھی، جس کی بنا پر مفتوحہ ممالک کی رعایا مسلمانوں کی گرویدہ ہو جاتی تھی۔

ایک اور سبب یہ بتایا کہ مسلمانوں نے اول اول حملہ شام و عراق پر کیا، جہاں کثرت سے عرب آباد تھے، جنھوں نے عیسائی ہونے کی وجہ سے اول اول مسلمانوں کا مقابلہ کیا، لیکن قومی اتحاد کا جذبہ رائگاں نہیں جا سکتا تھا، بڑے بڑے رئیس جلد مسلمان ہو گئے۔[2]

فتوحات فاروقی کو سکندر و چنگیز کی فتوحات سے تشبیہ دینا غلط اور بے محل بتایا ہے ان کی فتوحات قہر، ظلم، قتل عام کی بدولت تھیں، اسی لئے ان کی سلطنتیں دیرپا نہ ہوئیں۔ فوری فتوحات کے لئے اس قسم کی سفاکیاں کارگر ہوئیں۔

حضرت عمرؓ کی فتوحات میں سرمو قانون انصاف سے تجاوز نہیں ہوا، آدمیوں کا قتل عام درکنار درختوں کے کاٹنے، بچوں، بوڑھوں اور عورتوں سے تعرض کرنے کی ممانعت تھی۔ باغیوں اور خائنوں کو جلاوطن کیا جاتا تو ان کی جائداد کی قیمت ادا کر دی جاتی۔

سفاک فاتحین خود شریک جنگ ہو کر فوج کو لڑاتے تاکہ اس کا حوصلہ بلند رہے مگر حضرت عمرؓ اپنے زمانہ خلافت کی کسی جنگ میں شریک نہیں ہوئے البتہ فوج کی باگ ان کے ہاتھ میں رہتی تھی۔[3] ایک اور صریحی فرق یہ بتایا کہ:

---

[1] مولانا شبلی نعمانی۔ الفاروق حصہ دوم ص ۵، معارف پریس اعظم گڈھ۔ ۱۹۵۶ء/۱۳۷۶ھ [2] ایضاً ص ۵ و ۶ [3] ایضاً ص ۷ و ۸۔

"سکندر وغیرہ کی فتوحات گزرنے والے بادل کی طرح تھیں کہ ایک دفعہ زور سے آیا اور نکل گیا، ان لوگوں نے جو ممالک فتح کئے وہاں کوئی نظم حکومت نہیں قائم کیا، برخلاف اس کے فتوحات فاروقی میں یہ استواری تھی کہ جو ممالک اس وقت فتح ہوئے تیرہ سو برس گزرنے پر آج بھی اسلام کے قبضے میں ہیں اور خود حضرت عمرؓ کے عہد میں ہر قسم کے ملکی انتظامات وہاں قائم ہوگئے تھے"۔[1]

عام رائے یہ ہے کہ فتوحات میں خلیفہ وقت کی چنداں تخصیص نہ تھی۔ اس وقت کے جوش و عزم کی حالت خود تمام فتوحات کی کفیل تھی۔ مولانا کی رائے میں جوش واثر کی برقی قوت اسی وقت کام دے سکتی ہے جب کام لینے والا بھی اسی زور و قوت کا ہو۔ تمام فوج پتلی کی طرح ان کے اشاروں پر حرکت کرتی تھی، غرض ان کے خیال میں فاروق اعظم کے بغیر یہ کل مطلق کام نہیں دے سکتی تھی۔[2]

آخر میں ان کا یہ فیصلہ سننے کے لائق ہے:

"جب سے دنیا کی تاریخ معلوم ہے آج تک کوئی شخص فاروق اعظم کے برابر فاتح اور کشورستان نہیں گزرا"۔[3]

دوسرے عنوان کے تحت دکھایا ہے کہ حضرت عمرؓ کا نظام حکومت شخصی نہیں بلکہ جمہوری تھا جس میں عوام کو بھی مداخلت کا حق تھا اور خلیفہ عام حقوق میں سب سے مساوی تھا، اسی سلسلے میں ان کی مجلس شوریٰ، اس کی ہیئت، اس کے انعقاد کے طریقے وغیرہ زیر بحث آئے ہیں، نوعیت حکومت بتانے کے بعد وہ سلطنت کے نظم و نسق کے مختلف محکمہ جات اور

۱؎ مولانا شبلی نعمانی۔ الفاروق حصہ دوم۔ ص ۹، معارف پریس اعظم گڑھ ۱۹۵۶ء/۱۳۷۶ھ ۲؎ ایضاً
۳؎ ایضاً ص ۱۰

الگ الگ صیغوں کے قیام کا ذکر کرکے لکھتے ہیں:

"حضرت عمرؓ کے عجیب و غریب کارناموں میں ایک یہ بھی ہے کہ تمدن کی ابتدائی حالت ہونے کے باوجود بہت سے شعبے جو مخلوط تھے الگ کرکے جداگانہ محکمے قائم کئے"۔[1]

ملک کو صوبے، اضلاع اور پرگنوں میں تقسیم کرنے کا کام اسلام میں حضرت عمرؓ نے سب سے پہلے کیا اور اس زمانے کے لحاظ سے اس کے مناسب اور موزوں حدود قائم کئے، مورخین نے صوبوں کی جو تقسیم کی ہے اس کو صحیح ماننے کے باوجود اس میں ان کے اقوال پر بعض حیثیتوں سے بہت کچھ اضافے کئے۔ صوبوں میں بڑے بڑے افسر اور عہدہ داروں کے نام لکھے جن سے ان کے فرائض کا تعین ہوگیا ہے، پھر عہدہ داروں کے تقرر اور ان کے انتخاب میں حضرت عمرؓ کی جوہر شناسی دکھائی ہے، ان کی تنخواہیں، رشوت کے انسداد کے طریقے اور جرائم کے انسداد کے لئے کمیشن کے تقرر کا ذکر کیا ہے،[2] اس بحث کے دو اہم واقعے ذیل میں درج کئے جاتے ہیں:

"مصر کے عامل حضرت عیاض بن غنم کی یہ شکایت حضرت عمرؓ کو معلوم ہوئی کہ باریک کپڑے پہنتا ہے اور اس کے دروازے پر دربان مقرر ہے" انہوں نے حضرت محمد بن مسلمہ[3] سے کہا جس حالت میں پاؤ ساتھ لوا لاؤ، شکایت بجا تھی اسی ہیئت اور لباس میں ابن مسلمہ عیاض کو مدینہ لائے، حضرت عمرؓ نے وہ کرتا اتروا کر کمل کا کرتہ پہنایا اور بکریوں کا ایک گلہ منگوا کر حکم دیا کہ جنگل میں لے جاکر چراؤ۔ عیاض کو اس میں بڑی ذلت محسوس ہوئی، حضرت عمرؓ نے کہا تیرے باپ کا نام غنم اسی وجہ سے تھا کہ وہ بکریاں

۱؎ مولانا شبلی نعمانی۔ الفاروق حصہ دوم ص ۱۹ و ۲۰، معارف پریس اعظم گڑھ ۱۹۵۶ء/۱۳۷۶ھ
۲؎ ایضاً ص ۲۱ تا ۳۲ ۳؎ محمد بن مسلمہ انصاری مشہور صحابی تھے، حضرت عمرؓ نے تحقیقات کے عہدہ پر ان کو مامور کیا تھا۔

چراتا تھا۔ غرض عیاض نے دل سے توبہ کی اور آیندہ اپنے فرائض نہایت خوبی سے انجام دیتے رہے۔[1]

دوسرا واقعہ حضرت سعد بن وقاص کا ہے، انہوں نے کوفہ میں ایک محل بنوایا تھا جس میں ڈیوڑھی بھی تھی، حضرت عمرؓ نے اس خیال سے کہ اس سے اہل حاجت کو رکاوٹ ہوگا، محمد بن مسلمہ کو ڈیوڑھی میں آگ لگانے کا حکم دیا، انہوں نے تعمیل حکم کی اور حضرت سعد چپکے دیکھا کئے۔[2]

مولانا شبلیؒ نے اس قسم کی باتوں کے بظاہر قابل اعتراض ہونے کا ذکر کیا ہے، کیونکہ لوگوں کے طرز معاشرت و ذاتی افعال سے تعرض کرنا اصول آزادی کے خلاف ہے مگر اس کا یہ جواب بھی دیا ہے:

"حضرت عمرؓ تمام ملک میں مساوات اور جمہوریت کی جو روح پھونکنی چاہتے تھے وہ بغیر اس کے ممکن نہ تھی کہ وہ خود اور ان کے دست و بازو یعنی ارکان سلطنت اس رنگ میں ڈوبے نظر آئیں، عام آدمیوں کو اختیار ہے جو چاہیں کریں، ان کے افعال کا اثر بھی انہی کی حد تک محدود رہے گا، لیکن جو لوگ سلطنت کے ارکان ہیں ان کے طرز معاشرت کا ممتاز ہونا لوگوں کے دلوں میں اپنی حقارت کا خیال پیدا کرتا ہے اور رفتہ رفتہ اس قسم کی باتوں سے سلطنت شخصی کی وہ تمام خصوصیتیں پیدا ہو جاتی ہیں، جس کے یہ معنی ہیں کہ ایک شخص آقا اور باقی تمام لوگ غلام ہیں۔"[3]

مولانا شبلیؒ نے پولیٹکل مصالح اور عرب کے اصل مذاق مساوات و عدم ترجیح کے اصول پر اسی میں سلطنت کی کامیابی بتایا ہے پھر یہ احکام عرب کی آبادیوں میں محدود تھے، شام میں حضرت امیر معاویہؓ کے بڑے سرو سامان سے رہنے پر کچھ تعرض نہیں کرتے تھے، شام کے سفر میں حضرت عمرؓ نے ان کے خدم و حشم کو دیکھ کر اس قدر کہا "یہ نوشیروانی جاہ و جلال کیسا؟" انہوں نے جواب

[1] مولانا شبلی نعمانی، الفاروق حصہ دوم ص ۳۳۳، معارف پریس اعظم گڑھ، ۱۹۵۶ء/۱۳۷۶ھ [2] ایضاً
[3] ایضاً ص ۳۳۴۔

دیا یہاں رومیوں سے سابقہ رہتا ہے اور ان کی نظر میں اس کے بغیر سلطنت کا رعب داب قائم نہیں رہ سکتا۔[1]

اس کے بعد صیغہ محاصل کا بیان شروع ہوتا ہے جس میں امور ذیل پر بحث ہے۔

خراج کی ایجاد، عراق، شام اور مصر کے بندوبست، ہر جگہ کے جداگانہ اصول بندوبست، افسران بندوبست، اقسام اراضی و پیداوار، لگان کی شرح، مال گزاری کی ترقی، اس کی پیمایش اور اس میں صحت و احتیاط، افتادہ زمینوں کی آبادی، پیداوار و زراعت میں ترقی، مال گزاری کی وصولی میں سختی کی ممانعت، صیغہ محاصل میں اصلاحات، ترقی زراعت کے لئے ذرائع آب پاشی، نہر تالاب کھدانا، بند بنوانا، پانی کی تقسیم کے لئے دہانے بنانا، نہروں کے شعبے نکالنا، خراجی و عشری زمین، گھوڑوں پر زکوٰۃ اور عشور وغیرہ۔

شروع ہی میں حضرت عمرؓ کو عرب میں طریقہ خراج کا موجد بتایا، خراج کے نظم و نسق میں ان کو ایک بڑی دشواری کا سامنا کرنا پڑا، امرائے فوج کا اصرار تھا کہ تمام مفتوحہ مقامات صلہ فتح کے طور پر ان کی جاگیر میں عنایت کئے جائیں اور باشندوں کو ان کی غلامی میں دے دیا جائے، حضرت عمرؓ کی رائے تھی کہ زمین باشندوں کے قبضے میں رہنی دی جائے اور ان کو ہر طرح پر آزاد چھوڑ دیا جائے، حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ اور حضرت بلالؓ وغیرہ اہل فوج کے ہم زبان تھے بالآخر کثرت رائے سے حضرت عمرؓ کی رائے کے مطابق فیصلہ ہوا، ان کا استدلال سورۂ حشر کی آیت للفقراء الذین اخرجوا من دیارھم و اموالھم کے اخیر فقرے والذین جاؤا من بعدھم سے تھا کہ فتوحات میں آیندہ نسلوں کا بھی حق ہے لیکن اگر فاتحین کو تقسیم کر دیا جائے تو آنے والی نسلوں کے لئے کچھ باقی نہیں رہتا۔[2]

[1] علامہ شبلی نعمانی، الفاروق حصہ دوم ص ۳۴۳، معارف پریس اعظم گڑھ، ۱۹۵۶ء/۱۳۷۶ھ [2] ایضاً ص ۳۸۔

ایک خاص بحث یہ بھی توجہ طلب ہے کہ حضرت عمرؓ کے زمانے میں جس قدر خراج وصول ہوا زمانہ مابعد میں کبھی نہیں ہوا اور اسلام سے پہلے جس طرح خراج کا دفتر عراق و ایران میں فارسی زبان میں شام کا رومی اور مصر کا قبطی میں تھا حضرت عمرؓ کے عہد میں بھی اسی طرح رہا۔[1]

قانون مال گزاری کے صیغے میں حضرت عمرؓ نے جو سب سے بڑا انقلاب کیا جس کی وجہ سے رعایا کی بہبودی اور خوش حالی دفعتاً نہایت ترقی کر گئی، یہ تھا کہ زمین داری اور ملکیت زمین کا جو قدیم قانون تھا اور بالکل جابرانہ تھا مٹا دیا،[2] اس کی تفصیل اور مفتوح قوموں کے ساتھ دوسری رعایتوں نیز بندوبست مال گزاری میں ذمیوں سے رائے لینے وغیرہ کا ذکر کیا ہے۔

غیر قوموں کے ساتھ حضرت عمرؓ کے انصاف کا تذکرہ کرتے ہوئے مولانا کو معاً یہ خیال پیدا ہوا کہ کہیں یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ حضرت عمرؓ نے اپنی قوم کی حق تلفی کی اور ان کو زراعت اور فلاحت سے روک دیا، چنانچہ ارشاد فرماتے ہیں:

"درحقیقت اس سے حضرت عمرؓ کی بڑی انجام بینی کا ثبوت ملتا ہے، عرب کے اصلی جوہر یعنی دلیری، بہادری، جفاکشی، ہمت، عزم اسی وقت تک قائم رہے جب تک وہ کاشتکاری اور زمین داری سے الگ رہے، جس دن انھوں نے زمین کو ہاتھ لگایا اسی دن یہ تمام اوصاف بھی ان سے رخصت ہو گئے۔"[3]

صیغہ عدالت کا حال تحریر کرتے ہوئے پہلے یہ بتایا کہ محکمہ قضا کا قیام حضرت عمرؓ کی بدولت ہوا، اس کو انتظامی صیغے سے الگ کیا، اس کے لئے باا ثر اور رعب داب والا قاضی مقرر کیا، تمام اضلاع میں عدالتیں قائم کیں اور قاضی مقرر کئے، آبادی کے لحاظ سے قضاۃ کی کافی تعداد

---

[1] مولانا شبلی نعمانی، الفاروق حصہ دوم، ص ۴۲، معارف پریس اعظم گڈھ ۱۹۵۶ء/۱۳۷۶ھ۔ [2] ایضاً ص ۴۷، [3] ایضاً ص ۴۹۔

مقرر کی تاکہ فصل مقدمات میں حرج نہ ہو، قضاۃ کے انتخاب میں احتیاط اور نکتہ رسی سے کام لینا، تقرر کے وقت ان کا امتحان لینا، کوفہ کے گورنر حضرت ابو موسیٰ اشعری کے نام قضا کے اصول و آئین پر فرمان لکھا، رشوت سے محفوظ رکھنے کے وسائل اختیار کئے اور قاضیوں کی بیش قرار تنخواہیں مقرر کیں، دولت مند اور معزز شخص ہی کو قاضی مقرر کرتے، اس کو خرید و فروخت کی اجازت نہ دیتے انصاف میں مساوات سے کام لیا اور انصاف کو ارزاں اور آسان بنا دیا، عدالت کا مکان مصلحتاً نہیں بنوایا، مسجدوں پر اکتفا کیا، مصنف نے ان کے زمانے کے حکام عدالت کے نام لکھے اور آخر میں محکمہ افتا قائم کرنے کا ذکر کیا ہے، ایک اہم بحث شروع ہی میں یہ کی کہ رومن امپائر کے دوازدہ گانہ قواعد سے حضرت عمرؓ کے قواعد کا موازنہ کیا۔

مولانا نے فصل خصومات میں پورا عدل و انصاف جن باتوں پر موقوف بتایا ہے وہ یہ ہیں:

۱۔ عمدہ اور مکمل قانون جس کے مطابق فیصلے عمل میں آئیں ۲۔ قابل اور متدین حکام کا انتخاب ۳۔ وہ اصول اور آئین جن کی وجہ سے حکام رشوت اور دیگر ناجائز وسائل کے سبب فصل خصومات میں رو رعایت نہ کرنے پائیں۔

۴۔ آبادی کے لحاظ سے قضاۃ کی تعداد کا کافی ہونا تاکہ مقدمات کے انفصال میں حرج نہ ہونے پائے۔

اور حضرت عمرؓ کے متعلق فرماتے ہیں کہ ان تمام امور کا اس خوبی سے انتظام کیا کہ اس سے بڑھ کر نہیں ہو سکتا تھا۔[1]

فوج داری اور پولیس کے صیغے میں یہ لکھا ہے کہ مقدمات فوج داری کے لئے کوئی جدا محکمہ نہیں قائم کیا، پولیس کا صیغہ مستقل طور پر قائم ہو گیا تھا، اس صیغے میں جیل خانے بنوانا اور جلا وطنی

---

[1] مولانا شبلی نعمانی، الفاروق حصہ دوم، ص ۵۸، معارف پریس اعظم گڈھ ۱۹۵۶ء/۱۳۷۶ھ۔

کی سزا ان کی ایجاد ہے [1]

بیت المال یا خزانے کا صیغہ بھی حضرت عمرؓ کی بدولت ۱۵ھ میں اس طرح وجود میں آیا کہ حضرت ابو ہریرہ عامل بحرین ۵ لاکھ کی رقم لائے، حضرت عمرؓ نے صحابہ سے اس کے متعلق مشورہ کیا، ولید بن ہشام نے کہا میں نے سلاطین شام کے ہاں دیکھا ہے کہ خزانہ اور دفتر کا جدا جدا محکمہ قائم ہے، مولانا شبلی لکھتے ہیں:

"آج کل کا زمانہ ہوتا تو غیر مذہب والوں کے نام سے اجتناب کیا جاتا لیکن حضرت عمرؓ نے اس رائے کو پسند کیا اور بیت المال کی بنیاد ڈالی" [2]

حضرت عمرؓ نے سب سے بڑا خزانہ دار الخلافہ مدینہ منورہ میں قائم کیا اور اس کی نگرانی اور حساب کتاب کے لئے حضرت عبد اللہ بن ارقم کو خزانہ کا افسر مقرر کیا۔ تمام صوبہ جات اور صدر مقامات میں بیت المال قائم کئے، ان میں جس قدر رقم وہاں کے ہر قسم کے مصارف کے لئے ضروری ہوتی تھی رکھ لی جاتی تھی، باقی سال کے ختم ہونے کے بعد صدر خزانہ مدینہ منورہ کے بیت المال میں بھیج دی جاتی۔

مولانا نے لکھا ہے کہ حضرت عمرؓ تعمیر کے باب میں کفایت شعاری کرتے تھے لیکن بیت المال کی عمارتیں شاندار اور مستحکم بنوائیں [3]

پبلک ورک کو زمانہ حال کی ایجاد بتایا ہے، اسی لئے عربی میں اس کے لئے کوئی لفظ نہیں تھا، مصر و شام میں اس کا ترجمہ نظارت نافعہ کیا گیا ہے، اس میں جو چیزیں داخل ہیں مولانا کہتے ہیں شفاخانوں کے سوا ہر چیز حضرت عمرؓ کے زمانے میں نہایت منتظم اور وسیع طور پر موجود

[1] مولانا شبلی نعمانی، الفاروق حصہ دوم، ص ۶۶ و ۶۷، معارف پریس اعظم گڑھ ۱۹۵۶ء/۱۳۷۶ھ [2] ایضاً ص ۶۹ [3] ایضاً ص ۶۹ و ۷۰۔

تھی، مثلاً نہریں جو علاوہ ترقی زراعت کے اور اغراض کے لئے تیار ہوئیں، عمارات میں مذہبی (مساجد) فوجی (قلعے، چھاؤنیاں، بارکیں) کا نام لیا ہے لیکن موقع کے لحاظ سے یہاں آخر الذکر سے تعلق رکھنے والی عمارتوں کا کچھ حال تحریر کیا ہے جیسے دار الامارت، دیوان (دفتر) بیت المال، قید خانے، مہمان خانے، سڑکیں، پل اور مکہ سے مدینہ تک چوکیاں اور سرائیں [1]

شہروں کا آباد کرنا کے زیر عنوان حسب ذیل شہروں کے آباد کرنے کا ذکر اور ان کا حال بیان کیا ہے:-

بصرہ، کوفہ، فسطاط، موصل اور جیزہ۔

کوفہ کی جامع مسجد کی تعمیر کے ضمن میں اس کے آگے ایک وسیع اور دو سو ہاتھ لمبے سائبان بنائے جانے کا ذکر ہے جس کو سنگ رخام کے ستونوں پر قائم کیا گیا تھا جو نوشیروانی عمارات سے نکال کر لائے گئے تھے۔ اس سلسلے میں مولانا یہ بات یاد رکھنے کے قابل بتاتے ہیں:

"باوجود اس کے کہ در اصل نوشیروانی عمارت کا کوئی وارث نہ تھا اور اصول سلطنت کے لحاظ سے اگر کوئی وارث ہو سکتا تھا تو خلیفہ وقت ہوتا لیکن حضرت عمرؓ کا یہ عدل و انصاف تھا کہ مجوسی رعایا کو ستونوں کی قیمت ادا کی گئی، یعنی ان کی تخمینی جو قیمت ٹھہری، وہ ان کے جزیہ میں مجرا کی گئی" [2]

فوجی نظام میں اسلام سے پہلے کے فوجی سسٹم کو غیر منتظم اور اصول سیاست کے خلاف بتا کر رومن امپائر، فارس اور فرانس کے فوجی نظام کا حال بیان کیا ہے اور حضرت عمرؓ کے فوجی نظام کے بارے میں یہ لکھا کہ:

[1] مولانا شبلی نعمانی، الفاروق حصہ دوم، ص ۷۱ تا ۷۴، معارف پریس اعظم گڑھ ۱۹۵۶ء/۱۳۷۶ھ

[2] ایضاً ص ۸۰۔

"۱۵ھ ہی میں حضرت عمرؓ نے اس صیغے کو اس قدر منتظم اور باقاعدہ کر دیا کہ اس وقت کے لحاظ سے تعجب ہوتا ہے"۔[1]

پھر صیغہ فوج کے مختلف شعبوں اور انتظاموں کا بیان ہے، ممالک کو فوجی حیثیت سے تقسیم کرنے اور مختلف مقامات پر فوج کے صدر مقامات مقرر فرمانے اور ان کے وجوہ و اسباب پر بحث کی ہے، فوجی بارکوں، فوجی چھاؤنیوں، بحری قلعوں، فوجی حفظان صحت، محکمہ خبر رسانی، ہر سال ۳۰ ہزار نئی فوج تیار ہونے، ہر فوجی صدر مقام کے متعلق بڑے بڑے اصطبل ہونے کا ذکر ہے جن میں چار چار ہزار گھوڑے ہر وقت تیار رہتے تھے۔ فوج کی تنخواہوں اور رسد، خوراک، کپڑا اور بھتہ غرض ہر ہر چیز کا ذکر ہے، یہ بھی لکھا ہے کہ ان کی فوج میں ایرانی، رومی اور یہودی یہاں تک کہ ہندوستانی راجپوت اور جاٹ بھی شامل تھے۔

مولانا نے ایک جگہ بڑی دردمندی سے یہ لکھا:

"یہی نظام تھا جس کی بدولت ایک مدت تک تمام دنیا پر عرب کا رعب داب قائم رہا اور فتوحات کا سیلاب برابر بڑھتا گیا، جس قدر اس نظام میں کمی ہوتی گئی، عرب کی طاقت میں ضعف آتا گیا، سب سے پہلے امیر معاویہ نے اس میں تبدیلی کی یعنی شیر خوار بچوں کی تنخواہ بند کر دی، عبدالملک بن مروان نے اور بھی گھٹا دیا اور معتصم باللہ نے سرے سے فوجی دفتر میں سے عرب کے نام نکال دئے اور اسی دن درحقیقت حکومت بھی عرب کے ہاتھ سے نکل گئی"۔[2]

حضرت عمرؓ کے فوجی نظام کی یہ جامعیت اور وسعت مولانا کے قلم سے ملاحظہ ہو:

---

[1] مولانا شبلی نعمانی، الفاروق حصہ دوم ص ۸۶، معارف پریس اعظم گڈھ، ۱۹۵۶ء/۱۳۷۶ھ [2] ایضاً ص ۹۷۔

"حضرت عمرؓ نے اس سلسلے کے ساتھ انتظامات کے اور صیغوں پر بھی توجہ کی اور ایک ایک صیغے کو اس قدر منتظم کر دیا کہ اس وقت کے تمدن کے لحاظ سے ایک معجزہ سا معلوم ہوتا ہے، فوجوں کی بھرتی کا دفتر جس کی ابتدا مہاجرین اور انصار سے ہوئی تھی، وسیع ہوتے ہوتے قریباً تمام عرب کو محیط ہو گیا"۔[1]

صیغہ مذہبی میں اسلام کی اشاعت، اس کے طریقے اور اس کے اسباب لکھے ہیں اور بتایا ہے کہ خلیفہ ثانی کے مبارک عہد میں اسلام کثرت سے پھیلا۔ پھر قرآن مجید کے تعلق سے ان کی خدمات کی تفصیل بیان کی ہے، اسی طرح حدیث و فقہ کی ترویج و تعلیم کی کوششوں اور قرآن مجید کے معلمین اور قاریوں اور فقہار کی تنخواہیں مقرر کرنے کا ذکر کیا ہے، تعلیم کے مکاتب اور بدوؤں کی جبری تعلیم، شہسواری اور کتابت سکھانے کا تذکرہ بھی ہے، امام و موذن اور رہبر حج مقرر کرنے اور ان کو تنخواہیں دینے، ممالک مفتوحہ میں بہ کثرت مساجد کی تعمیر، حرم کی عمارت کی توسیع اور اس کی نوبیب و زینت پر توجہ دینے، غلاف کعبہ قباطی بنانے اور مسجد میں فرش اور روشنی کا انتظام کرنے، غرض ایک ایک جزئیہ پر بحث کی ہے۔

متفرق انتظامات کے ضمن میں سب سے مشہور چیز سنہ ہجری مقرر کرنا ہے، اس کے علاوہ مختلف قسم کے رجسٹر تیار کرانا جیسے خراج کا دفتر، بیت المال کے کاغذات کا حساب، مصارف جنگ کے کاغذات، مردم شماری کے کاغذات، لوگوں کے اوصاف کے لحاظ سے ان کی فہرستیں تیار کرانا، تحریری معاہدے حفاظت سے صندوق میں رکھنے اور سکوں کی ایجاد پر بحث کی ہے۔

ذمیوں کے حقوق بیان کرتے ہوئے سب سے پہلے یہ دکھایا ہے کہ حضرت عمرؓ نے ان کو جو حقوق دئے اور جس طرح ان کی مذہبی آزادی برقرار رکھی اور ان سے کئے گئے معاہدوں کی پابندی کی

---

[1] مولانا شبلی نعمانی، الفاروق حصہ دوم ص ۹۹، معارف پریس اعظم گڈھ، ۱۹۵۶ء/۱۳۷۶ھ۔

اس کی مثال اسلام سے پیش تر اور اس کے بعد کہیں نہیں مل سکتی۔ حضرت عمرؓ نے مسلمانوں ہی کے بقدر ذمیوں کو حقوق دے کر دونوں کو ہم سر بنا دیا تھا اور سازش و بغاوت کے باوجود ان کے معاملے میں مراعات برتتے تھے۔ یہاں بعض اہم باتوں کا ذکر کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

عربسوس کے ذمی معاہدہ صلح کے بعد بھی در پردہ رومیوں سے سازش رکھتے تھے اور ادھر کی خبریں ان کو پہنچاتے تھے، حضرت عمرؓ نے وہاں کے حاکم عمیر بن سعد کو لکھا کہ ان کی جائداد، زمین، مویشی اور اسباب سب شمار کر کے ایک ایک چیز کی دو چند قیمت دے دو اور ان سے کہو کہ اور کہیں چلے جائیں۔ اگر اس پر راضی نہ ہوں تو ان کو ایک برس کی مہلت دو اور اس کے بعد جلاوطن کر دو، چنانچہ جب وہ اپنی شرارت سے باز نہ آئے تو اس حکم کی تعمیل کی گئی، مولانا لکھتے ہیں:

"کیا آج کل کوئی قوم اس درگزر اور عفو و مسامحت کی کوئی نظیر دکھلا سکتی ہے"[1]

سازش اور بغاوت کے باوجود انہیں مراعات دئے جاتے رہنے کے بارے میں لکھتے ہیں:

"آج کل جن حکومتوں کو تہذیب و ترقی کا دعویٰ ہے، رعایا کے ساتھ ان کی تمام عنایت اسی وقت تک ہے جب تک ان کی طرف سے کوئی پولیٹکل شبہ نہ پیدا ہو، ورنہ دفعتاً وہ تمام مہربانی غضب اور قہر سے بدل جاتی ہے اور ایسا خون خوار اور پُرغیظ انتقام لیا جاتا ہے کہ وحشی قومیں بھی اس سے کچھ زیادہ نہیں کر سکتیں، برخلاف اس کے حضرت عمرؓ کا قدم کسی حالت میں جادۂ انصاف سے ذرا نہیں ہٹا"[2]

آخر میں ان واقعات کی اصل حقیقت واضح کی ہے جن کی وجہ سے یہ غلط خیال پیدا ہوا

[1] مولانا شبلی نعمانی، الفاروق حصہ دوم، ص ۱۳۶، معارف پریس اعظم گڑھ، ۱۹۵۶ء/۱۳۷۶ھ

[2] ایضاً ص ۱۳۷۔

یا ہو سکتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے یا خود اسلام نے ذمیوں کے ساتھ نا انصافانہ سلوک کیے۔ ان کے دے گئے جو احکام مخالف کے نزدیک قابل اعتراض ہو سکتے ہیں ان کی یہ فہرست دی ہے۔

وضع و لباس وغیرہ میں کسی طرح مسلمانوں کا تشبہ نہ کرنے پائیں، کمر میں زنار باندھیں، لمبی ٹوپیاں پہنیں، گھوڑوں پر کاٹھی کسیں، نئی عبادت گاہیں نہ بنائیں، شراب اور سور نہ بیچیں، ناقوس نہ بجائیں، صلیب نہ نکالیں، بنو تغلب اپنی اولاد کو اصطباغ نہ دینے پائیں، عرب سے یہودیوں اور عیسائیوں کو جلا وطن کر دیا۔ جزیہ عائد کیا۔ ان میں سے بعض کا جواب تمہید میں گذر چکا ہے، یہاں ان سب کا بڑا مدلل و مسکت جواب دیا ہے[1] جن کو طوالت کے خوف سے نظر انداز کیا جاتا ہے۔

غلامی کا رواج کم کرنا میں دکھایا ہے کہ گو غلامی کو معدوم نہیں کر سکے لیکن غلاموں کو احرار کا رتبہ اور غلامی کو برادری اور ہمسری بنا دیا۔ اس کے ثبوت میں ان کے ساتھ مراعات اور دوسرے حسن سلوک کی تفصیل لکھی ہے اس ضمن میں غلط طور پر مشہور ہو جانے والے حضرت شہر بانو کے قصہ کی تردید کی ہے۔

عام طور پر مشہور ہے کہ فتح ایران کے بعد یزدگرد شہنشاہ فارس کی بیٹیاں گرفتار ہو کر مدینہ میں آئیں تو حضرت عمرؓ نے عام لونڈیوں کی طرح بازار میں ان کو بیچنے کا حکم دیا لیکن حضرت علیؓ نے خاندان شاہی کے ساتھ ایسا سلوک ناروا بتا کر مشورہ دیا کہ لڑکیوں کی قیمت کا اندازہ کر کے کسی کے اہتمام و سپردگی میں ان کو دے دیا جائے اور خود اپنے اہتمام میں لے کر ایک امام حسین کو اور دوسری محمد بن ابی بکر اور تیسری عبداللہ بن عمرؓ کو عنایت کی۔

[1] مولانا شبلی نعمانی، الفاروق حصہ دوم، ص ۱۳۶ تا ۱۵۴، معارف پریس اعظم گڑھ ۱۹۵۶ء/۱۳۷۶ھ

مولانا نے اس غلط قصہ کی حقیقت یہ بتائی کہ زمخشری نے ربیع الابرار میں اس کو لکھا اور ابن خلکان نے امام زین العابدین کے حال میں یہ روایت ان کے حوالہ سے نقل کر دی۔

مولانا نے اس کے غلط ہونے کی یہ وجہیں لکھی ہیں۔

۱۔ زمخشری کو فن تاریخ سے کچھ واسطہ نہیں، ان کا اس میں جو پایہ ہے وہ ظاہر ہے۔

۲۔ طبری، ابن الاثیر، یعقوبی، بلاذری، ابن قتیبہ وغیرہ کسی نے اس واقعہ کو نہیں لکھا۔

۳۔ تاریخی قرائن اس کے بالکل خلاف ہیں، حضرت عمرؓ کے عہد میں یزدگرد اور خاندان شاہی پر مسلمانوں کو مطلق قابو نہیں حاصل ہوا، مدائن کے معرکہ میں یزدگرد مع تمام اہل و عیال کے دار السلطنت سے نکلا اور حلوان پہنچا، جب مسلمان حلوان پر بڑھے تو وہ اصفہان بھاگ گیا اور پھر کرمان وغیرہ میں ٹکراتا پھرا، مرو میں پہنچ کر ۳۰ھ میں جو حضرت عثمانؓ کی خلافت کا زمانہ ہے مارا گیا، اس کی آل و اولاد اگر گرفتار ہوئے ہوں گے تو اسی وقت گرفتار ہوئے ہوں گے۔

۴۔ واقعہ کے وقت حضرت حسینؓ کی عمر بارہ[12] برس تھی، وہ ہجرت کے پانچویں سال پیدا ہوئے اور فارس ۱۷ھ میں فتح ہوا، اس لئے یہ امر بھی کس قدر مستبعد ہے کہ حضرت علیؓ نے نابالغی میں ان پر اس قسم کی عنایت کی ہوگی، اس کے علاوہ ایک شہنشاہ کی اولاد کی قیمت نہایت گراں قرار پائی ہوگی اور حضرت علیؓ نہایت زاہدانہ اور فقیرانہ زندگی بسر کرتے تھے۔

۵۔ حضرت عمرؓ کی تاریخ میں اس قسم کا واقعہ جو مسلّم طور پر ثابت ہے اس میں وہی برتاؤ کیا گیا جو تہذیب و انسانیت کا مقتضا تھا اور جو آج بھی تمام مہذب ملکوں میں جاری ہے۔

مصر پر چڑھائی میں حضرت عمرو بن العاصؓ نے اول بلبیس پر حملہ کیا، اتفاق سے مقوقس بادشاہ مصر کی بیٹی جس کا نام ارمانوسہ تھا یہیں مقیم تھی، وہ بھی گرفتار ہوئی، عمرو بن العاصؓ نے اس کو نہایت عزت و حرمت سے مقوقس کے پاس بھیج دیا اور مزید احتیاط کے لئے اپنے ایک سردار کو

جس کا نام قیس بن ابی العاصؓ سہمی تھا ساتھ کر دیا کہ حفاظت کے ساتھ پہنچا آئے۔[1]

سیاست و تدبیر، عدل و انصاف:- یہ الفاروق کا بڑا اہم باب اور حضرت عمرؓ کی زندگی کا سب سے درخشاں پہلو ہے۔ اس کے عنوانات سے اس کی اہمیت کا اندازہ ہوگا۔

عام سلاطین اور حضرت عمرؓ کے طریق سیاست میں فرق۔ رعایا کی اطاعت و انقیاد کو جابرانہ سیاست سے پرہیز میں دخل نہ تھا، حضرت عمرؓ کی مشکلات، ان کی حکومت کی خصوصیتیں، اصول مساوات، امیر المومنین کا لقب کیوں اختیار کیا۔ سیاست کے اصول سے واقف تھے، مختلف ممالک کی مناسبت سے الگ الگ تدبیریں کیں، بغاوت کے استیصال کے لئے جنگی مقامات پر عرب آباد کرائے اور فوجی چھاؤنیاں قائم کیں، عرب میں پولیٹکل تدبیروں سے کام لیا (یہودیوں اور عیسائیوں کو عرب سے نکالا، بڑے بڑے افسروں کو بدلتے رہے۔ عزیز و اقارب کو عہدے نہ دئے) فریب اور حکمت عملی سے پرہیز کیا، عہدہ داروں کا عمدہ انتخاب کیا، بے لاگ عدل و انصاف سے کام لیا، قدیم سلطنتوں کے حالات سے واقفیت حاصل کی، حالات سے باخبر رہنے کے لئے پرچہ نویس اور واقعہ نگار مقرر کئے، بیت المال کا خیال رکھتے، تمام کاموں کو وقت پر انجام دیتے، غربا و مساکین کے روزینے مقرر کئے، لنگر خانے اور مہمان خانے بنوائے، لاوارث بچوں کا انتظام بیت المال سے کرایا۔ یتیموں کی پرورش اور ان کی جائداد کی حفاظت کا انتظام کیا، قحط کے انتظام میں سرگرمی دکھائی، جزئیات پر توجہ دیتے اور چھوٹے چھوٹے کام خود انجام دیتے، رعایا کی شکایتوں سے واقفیت حاصل کرنے کے وسائل اختیار کرتے، رعایا کے آرام و آسایش کا خیال اور ان کی خبر گیری رکھتے۔ وغیرہ

حضرت عمرؓ کے اس اہتمام کہ "ممالک محروسہ میں کوئی شخص فقر و فاقہ میں مبتلا نہ ہونے

---

[1] مولانا شبلی نعمانی، الفاروق حصہ دوم، ص ۱۵۷ تا ۱۵۹، معارف پریس اعظم گڑھ ۱۹۵۶ء/۱۳۷۶ھ۔

پائے" اور رعایا کی ہر طرح خبرگیری، قحط کے زمانے میں داد و دہش وغیرہ کا ذکر کرتے ہوئے ایک جگہ یہ بڑی اہم بات لکھی ہے:

"اس موقع پر یہ بات خاص طور پر توجہ دینے کے قابل ہے کہ حضرت عمرؓ کو اگرچہ ملک کی پرورش اور پرداخت کا اتنا کچھ اہتمام تھا لیکن ان کی یہ فیاضی ایشیائی قسم کی فیاضی نہ تھی جس کا نتیجہ کاہلی اور مفت خوری کا رواج دینا ہوتا ہے، ایشیا میں سلاطین و امراء کی فیاضیوں کا ذکر عموماً بڑے ذوق سے کیا جاتا ہے، لیکن لوگ اس بات کا خیال نہیں کرتے کہ اس سے جہاں ایک بادشاہ کی مدح نکلتی ہے، دوسری طرف قوم کا دریوزہ گر ہونا اور انعام و بخشش پر لو لگائے رہنا ثابت ہوتا ہے، یہی ایشیائی فیاضیاں تھیں جس نے آج ہماری قوم میں لاکھوں آدمی ایسے پیدا کر دئے ہیں جو خود ہاتھ پاؤں ہلانا نہیں چاہتے اور نذر و نیاز وغیرہ پر اوقات بسر کرتے ہیں"۔[1]

اس بحث میں مصنف نے حضرت عمرؓ کی تدبیر و سیاست کے جو واقعات اور مثالیں لکھی ہیں ان کی بنا پر ان کا یہ لکھنا تمام تر درست ہے۔

"ان واقعات سے ہر شخص اندازہ کر سکتا ہے کہ حضرت عمرؓ کو سیاست و تدبیر کے فن میں جو کمال حاصل تھا کسی مدبر اور فرماں روا کے حالات میں اس کی نظیر نہیں مل سکتی۔

ان کی حکومت کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ آئین حکومت میں شاہ و گدا، شریف و رذیل، عزیز و بے گانہ سب کا ایک رتبہ تھا"۔[2]

[1] مولانا شبلی نعمانی، الفاروق حصہ دوم، ص ۱۸۳، معارف پریس اعظم گڈھ ۱۹۵۶ء/۱۳۷۶ھ۔

[2] ایضاً ص ۹۵۔

امامت واجتہاد اس عظیم الشان عنوان کے تحت انہوں نے ۵۰ سے زیادہ صفحے لکھے ہیں، اس میں ان کے علمی کمالات، دین و عقیدہ اور سیرت و اخلاق میں پختگی، حدیث و فقہ میں تبحر، علم اسرار الدین کی بنا اور اجتہاد و استنباط میں مہارت وغیرہ پر بحث کی ہے، اس کی بعض اہم بحثوں کی طرف اہل نظر کو متوجہ کرانا مناسب ہوگا۔

مولانا کے نزدیک مذہبی احکام اور عقائد اگرچہ بظاہر صاف اور سادہ ہیں لیکن ان مسائل میں اشتباہ اور ابہام اس قدر ہے کہ اگر نہایت نکتہ سنجی اور دقیقہ رسی سے کام نہ لیا جائے تو ان کی یہ حقیقت بالکل بدل جاتی ہے، اسلام انہی غلطیوں کو مٹانے کے لئے آیا، چنانچہ لکھتے ہیں:

"لیکن چونکہ عام طبائع نکتہ سنج نہیں ہوتیں اس لئے ہر زمانے میں اکثر لوگ اصل حقیقت سے دور ہو جاتے تھے اور اسی لئے ائمہ اور مجددین کی ضرورت باقی رہی کہ ان اسرار پر پردہ نہ پڑنے پائے، مثلاً اسلام نے شرک کو کس زور و شور سے مٹایا لیکن غور سے دیکھو تو قبروں اور مزاروں کے ساتھ عوام ایک طرف، خواص کا جو طرز عمل ہے اس میں اب بھی شرک کا کس قدر مخفی اثر موجود ہے گو استفادہ عن القبور اور حصول برکت کے خوش نما الفاظ نے ان پر پردہ ڈال رکھا ہے۔

حضرت عمرؓ نے ان نازک اور مشتبہ مسائل میں جس طرح اصل حقیقت کو سمجھا اور جس جرات و دلیری سے اس کو لوگوں کے سامنے ظاہر کیا، اس کی نظیر صحابہ کے زمانے میں بھی بہت کم ملتی ہے"۔[1]

مذہبی احکام کے متعلق شروع سے دو خیال چلے آتے ہیں: ایک یہ کہ ان میں عقل کو دخل نہیں، دوسرا یہ کہ اس کے تمام احکام اصول عقلی پر مبنی ہیں، حضرت عمرؓ اسی دوسرے اصول

[1] مولانا شبلی نعمانی، الفاروق حصہ دوم، ص ۱۹۰، ۱۹۱، معارف پریس اعظم گڈھ ۱۹۵۶ء/۱۳۷۶ھ۔

کے قائل تھے اور وہ سب سے پہلے شخص ہیں جس نے علم اسرار الدین کی بنیاد ڈالی۔[1]

مولانا شبلی کے خیال میں نبوت کی حقیقت کی نسبت عموماً لوگ یہ کرتے آئے ہیں، اکثروں کا خیال ہے کہ نبی کا ہر قول و فعل خدا کی طرف سے ہوتا ہے، مگر مولانا لکھتے ہیں :

"نبی جو حکم منصب نبوت کی حیثیت سے دیتا ہے وہ بے شبہ خدا کی طرف سے ہوتا ہے باقی امور وقت اور ضرورت کے لحاظ سے ہوتے ہیں، تشریعی اور مذہبی نہیں ہوتے، اس مسئلے کو جس قدر حضرت عمرؓ نے صاف اور واضح کر دیا کسی نے نہیں کیا، خراج کی تشخیص، جزیہ کی تعیین، ام ولد کی خرید و فروخت وغیرہ مسائل کے متعلق امام شافعی نے اپنی کتابوں میں نہایت ادعا کے ساتھ احادیث سے استدلال کیا ہے اور ان مسائل میں جہاں حضرت عمرؓ کا طریق عمل مختلف ہے بڑی دلیری سے ان پر قدح کی ہے لیکن امام شافعی نے یہ نکتہ نظرانداز کیا کہ یہ امور منصب نبوت سے تعلق نہیں رکھتے اس لئے ان مسائل میں خود شارع علیہ السلام کی طرف سے ہر شخص کو اجتہاد کی اجازت ہے"۔[2]

آگے اس مسئلے کو حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کے ارشادات کی روشنی میں اور صاف کر دیا ہے۔[3]

فے، خمس، باغ فدک وغیرہ کے متعلق حضرت عمرؓ کی رائے کو پوری طرح منقح کر دیا ہے[4] اور اخیر میں لکھا ہے :

"ان واقعات سے تم اندازہ کر سکتے ہو کہ مسائل کو جو ابتدا سے آج تک معرکہ آرا رہے ہیں اور جن میں بڑے بڑے اکابر صحابہ کو اشتباہ ہوا، حضرت عمرؓ نے کس خوبی سے طے کیا کہ ایک طرف تو قرآن و حدیث کا صحیح محمل وہی ہو سکتا ہے اور دوسری طرف اصول سلطنت و نظام

---

[1] مولانا شبلی نعمانی، الفاروق حصہ دوم، ص ۱۹۳، معارف پریس اعظم گڈھ ۱۹۵۶ء/۱۳۷۶ھ [2] ایضاً ص ۱۹۳ [3] ایضاً ص ۲۱۸ [4] ایضاً ص ۲۲۶ تا ۲۳۰۔

تمدن سے بالکل مطابقت رکھتا ہے"۔[1]

ذاتی حالات اور اخلاق و عادات: میں حضرت عمرؓ کی جامعیت، امارت کی اہلیت کے اوصاف سے متصف ہونے، ملکہ تقریر، قوت تحریر، مذاق شاعری، انساب و عبرانی زبان سے واقفیت، ذہانت و طباعی، حکیمانہ مقولے، اصابت رائے، نکتہ رسی، مذہبی زندگی (عبادت، نماز، روزہ، حج، مواخذہ قیامت کا خوف) بے تعصبی (عیسائیوں کے برتن اور کھانے کا استعمال) علمی صحبتیں، اہل علم و فضل سے صحبت، اصحاب کمال کی قدردانی، رسول اللہ ﷺ کے رشتہ داروں کا خیال، تواضع و سادگی، زندہ دلی، مزاج کی سختی، آل و اولاد سے محبت، مسکن، وسائل معاش (تجارت اور جاگیر، تنخواہ) غذا، لباس، سادگی اور بے تکلفی، رہبانیت اور تقشف سے بیزاری، حلیہ کا ذکر ہے۔ اخیر میں ان کے ۳۵ اولیات کی فہرست دی ہے۔

ازواج و اولاد میں ازواج و اولاد کا مختصر ذکر ہے۔

خاتمہ میں یہ دکھایا ہے کہ دنیا کا کوئی نامور حضرت عمرؓ کا ہمسر اور ہم پایہ نہ تھا، ان کی جامعیت کا یہ حال تھا کہ :

"وہ سکندر بھی تھے اور ارسطو بھی، مسیح بھی تھے اور سلیمان بھی، تیمور بھی تھے اور نوشیرواں بھی، امام ابو حنیفہ بھی تھے اور ابراہیم ادہم بھی"۔[2]

اوروں اور حضرت عمرؓ کا یہ فرق بھی دکھایا ہے کہ ہر حکمراں کی حکومت کی تہ میں کوئی نہ کوئی مشہور مدبر یا سپہ سالار مخفی تھا، مگر حضرت عمرؓ کو صرف اپنے دست و بازو کا بل تھا۔[3]

علمی حیثیت سے فائق اور اخلاقی لحاظ سے بجز انبیا کے سب ان سے ہیچ تھے، اخیر کے دو

---

[1] مولانا شبلی نعمانی، الفاروق حصہ دوم، ص ۲۴۰، معارف پریس اعظم گڈھ ۱۹۵۶ء/۱۳۷۶ھ [2] ایضاً ص ۲۸۷ [3] ایضاً ص ۲۸۷۔

صفحے میں حضرت شاہ ولی اللہؒ کی ایک تحریر نقل کی ہے، اس سے بھی حضرت عمرؓ کا جامع کمالات ہونا ظاہر ہوتا ہے۔

علامہ شبلی کے بقول الفاروق میں حضرت عمرؓ کے سوانح و حالات تفصیل کے ساتھ اور اور اس صحت کے ساتھ لکھے گئے، جو تاریخی تصنیف کی صحت کی اخیر حد ہے، خصوصاً ان کی حکومت کے کارنامے اور اس کے تمام شعبوں کی خصوصیات کو جس طرح نمایاں کیا ہے اس سے ان کی خاص نکتہ سنجی، دقیقہ بینی اور سعی و محنت کا پتہ چلتا ہے مگر افسوس ہے کہ اس تاریخ ساز تصنیف کی یہ سب سے بڑی خوبی بعض کوتاہ نظر لوگوں کے نزدیک اس کا عیب بن گئی ہے ؎

رعنائی خیال کو ٹھہرا دیا گناہ　　　زاہد بھی کس قدر ہے مذاق سخن سے دور

اس کی تردید کے لئے علامہ شبلی کے ایک پایہ شناس کا یہ اقتباس نقل کرکے مضمون ختم کیا جاتا ہے:

"ناظرین کو شاید وہ خاص مقصد معلوم نہ ہو جس نے علامہ کو الفاروق کی تالیف پر آمادہ کیا تھا، علامہ اگرچہ قدیم اسلامی طرز تعلیم کے تربیت یافتہ تھے لیکن عام علمار کی طرح دنیا کے حالات و واقعات سے بے خبر نہ تھے، ان کے دل میں قوم و ملت کا درد تھا، ان کی نظر تہذیب مغرب کی ان فریب کاریوں اور ملمع سازیوں کی حقیقت شناس تھی جن سے مسحور ہوکر مسلمانوں کا جدید تعلیم یافتہ طبقہ یہ سمجھ رہا تھا کہ فطرت انسانی کی ہر قابلیت خواہ وہ علم وفن کی ہو یا سیاست و تدبیر کی، صرف دیار مغرب ہی کو حاصل ہے، یہ غلامانہ احساس کمتری دراصل اسلاف کے شاندار کارناموں سے ناواقفیت کا نتیجہ تھا، اس لئے ضرورت تھی کہ تاریخ اسلام کا ایک ایسا زریں ورق الٹا جائے جس کو دیکھ کر مسلمان محسوس کریں کہ وہ ایک ایسے مذہب کے پیرو ہیں جس کی روحانی قوت بڑے بڑے کج کلاہوں کے ایوان

اقتدار کی بنیادوں کو متزلزل کرسکتی ہے، اس کے لئے فاروق اعظمؓ ہی کے کوکبۂ جلال و عظمت کا منظر کام آسکتا تھا جس کو پیش کرکے علامہ نے مسلمانوں کی آنکھیں کھول دیں اور کامل یقین واعتماد کے ساتھ دنیا کے تمام حریفوں کو چیلنج دیا کہ جس احتیاط و قید کے ساتھ حضرت عمرؓ نے فتوحات کیں، جس طرح قیصر و کسریٰ کے قصر ہائے فلک بوس کے کنگروں پر مٹھی بھر بے سرو سامان صحرانشینوں کے ہاتھوں سے اسلام کا پرچم اقبال لہرایا، فرش خاک پر بیٹھ کر حکومت و فرماں روائی کا جو جاہ و جلال دکھایا، عام رعایا کو مساوات و آزادی کے جو گراں بہا حقوق عطا کئے، عدل و انصاف کا جو نمونہ پیش کیا، صاحب حکومت ہوتے ہوئے ایک عام آدمی کی طرح جس سادگی کے ساتھ زندگی بسر کی، ایک غیر متمدن ملک کی خاک سے پیدا ہوکر جو وسیع نظام سلطنت قائم کیا، اگر دنیا کے کسی فاتح یا حکمراں کے حالات زندگی میں اس کی کوئی نظیر موجود ہو تو پیش کرو"۔

اس چیلنج کو ایک مدت دراز گذر گئی لیکن اس کے جواب میں آج تک دنیا کے کسی گوشہ سے کوئی صدا بلند نہیں ہوئی۔[1]

---

[1] مرزا احسان احمد، مقالات احسان، ص ۶۹-۷۰، معارف پریس اعظم گڑھ ۱۹۶۸ء/ ۱۳۸۷ھ۔

سلاطین کشمیر کے دور میں فارسی شعراء

از

پروفیسر عبدالاحد رفیق۔ کشمیر

کشمیر زمانہ قدیم سے ہی علم و ادب کا گہوارہ اور تہذیب و ثقافت کا ایک اہم مرکز رہا ہے۔ سلاطین کے عہد میں کشمیر میں ثقافت کا معیار بہت بلند تھا۔ وادی میں فنون لطیفہ، ادب اور موسیقی کے کافی قدرداں تھے۔ کشمیری نہایت طباع، ذہین اور حاضر جوابی میں بے مثال تھے۔ فنی شعور ان میں بدرجہ اتم موجود تھا۔ انہیں علم سے محبت تھی اور وہ علم کی تلاش و حصول میں ہندوستان، ترکستان اور ایران کے دور دراز مقامات میں چلے جاتے تھے۔ سلاطین علوم و فنون کے نہ صرف مربی تھے بلکہ بعض تو خود شاعر اور فن موسیقی کے ماہر تھے۔ اہل علم، مغنی اور مصوران کے دربار کی زینت تھے۔ راجدھانی سری نگر عظیم الشان محلوں، مسجدوں، خانقاہوں اور باغوں سے بھری تھی[1]۔

کشمیر اور ایران کے ثقافتی تعلقات کی تاریخ بہت پرانی ہے۔ اس کا ثبوت سری نگر کے قریب خانقاہوں اور کشمیری قدیم سنگ تراشی کے نمونوں سے ملتا ہے۔ جن میں ساسانی اثر بلاشبہ ظاہر ہے۔ عہد سلاطین میں اور زمانوں کے مقابلے میں کشمیر اور ایران میں زیادہ قریبی ثقافتی تعلقات قائم ہوئے۔ جن کو جناب حضرت سید بلبل شاہؒ اور جناب سید علی ہمدانیؒ نے مزید تقویت پہنچائی۔

[1] رشیدی، ص ۱۴۴۔

شہاب الدین سلطان کے عہد میں فارسی نے سنسکرت کی جگہ لی اور پانچ سو سال سے زائد عرصہ تک دفتری اور علمی ادبی زبان کی حیثیت سے اپنا کام کرتی رہی۔ ان حالات میں یہاں فارسی زبان و ادب اور شاعری کے لئے ایک سازگار ماحول پیدا ہوا اور یہاں بڑے بڑے عالم، فاضل اور شاعر تولد ہوئے۔ حیرت اس پر ہوتی ہے کہ اعلیٰ پایہ شاعروں کا یہ سلسلہ کبھی ٹوٹنے نہ پایا۔ حالانکہ کشمیر کی تاریخ میں بعض دور ایسے بھی آئے ہیں جو شعر و سخن کی فضا کے لئے ناسازگار تھے اور ان ناسازگار حالات میں بھی شعر و سخن اور کمال فن کی چنگاریاں بجھنے نہ پائیں۔ بلکہ جہاں اور جب بھی موقع ملا یہ اپنی تابناکیوں کے ساتھ چمک اٹھیں۔

کشمیری حسن، نفاست اور آرٹ سے گہری دلچسپی رکھتے ہیں۔ انہیں فنون لطیفہ کے ساتھ بڑی مناسبت رہی ہے۔ خواجہ حافظ شیرازی نے تخیل کی بلند پروازی کے ساتھ کتنی حقیقت افروز بات کہی ہے[1]

بہ شعر حافظ شیراز می گویند و می رقصند　　سیہ چشمان کشمیری و ترکان سمرقندی

کشمیر میں فارسی زبان کے قدیم شاعر جناب سید محمد خاوری ہیں جو حضرت سید علی ہمدانیؒ کے مصاحبین میں سے تھے۔ اگرچہ آپ کا زیادہ وقت عبادت، ریاضت اور ذکر و فکر میں بسر ہوتا تھا مگر اس کے باوجود آپ علمی مشاغل اور فکر سخن میں بھی مصروف ہوتے تھے۔ آپ کی تصانیف میں شرح لمعات اور خاور نامہ مشہور ہیں۔ بقول خواجہ محمد اعظم طبیعت موزوں تھی اور شعر و شاعری سے بھی دلچسپی رکھتے تھے آپ کے یہ اشعار جو آپ نے حضرت سید علی ہمدانی رحمۃ اللہ علیہ کی تشریف آوری کے موقع پر کہے ہیں، عوام میں مشہور ہیں[2]

میر سید علی شیر ہمدانی سیر اقلیم سبعہ کرد نکو　　شد مشرف مقدش کشمیر و اہل آن شہر را ہدایت جو

[1] ماخذ تاریخ ادبیات ایران ج ۳ ص ۲۸۳ [2] آب کوثر از شیخ اکرام ص ۳۰۸۔

سال تاریخ مقدم اورا
یابی از مقدم شریف او

ان اشعار کے سوا آپ کا کوئی اور کلام نہیں ملا ہے۔ جناب سید محمد خاوری حضرت سید احمد سامانی کے مقبرے میں مدفون ہوئے ہیں جو کہ فتح کدل سری نگر کے قریب واقع ہے[1]

اس دور کے ایک اور فارسی شاعر کا ذکر بھی تذکروں میں ملتا ہے اور وہ ہیں شیخ محمد سرائی۔ یہ بھی حضرت سید علی ہمدانی رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ کشمیر میں تشریف لائے تھے۔ آپ روحانی بزرگ تھے اور اپنے وقت کے بہترین صلحاء اور علماء میں شمار ہوتے تھے۔ آپ نے ۷۸۶ھ میں وفات پائی[2]

حضرت سید علی ہمدانی رحمۃ اللہ علیہ کی وفات پر یہ چند اشعار یادگار ہیں[3]

مظہر عارفان شہ ہمدان — کز وجش باغ معرفت بشگفت
مظہر نور حق کہ رویش را — عاقبت از جہانیاں نہفت
عقل تاریخ سال رحلت او — سید ما علی ثانی گفت (۷۸۶)

کشمیر میں فارسی علم و ادب کی توسیع و ترقی میں حضرت سید علی ہمدانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا نمایاں کارنامہ رہا ہے۔ حضرت سید مذکور سلطان شہاب الدین کی وفات سے ایک سال پہلے کشمیر میں تشریف فرما ہوئے۔ چونکہ سلطان شہاب الدین بہت دین دار اور درویش دوست تھا۔ اس نے جناب شاہ ہمدان کو بڑے احترام کے ساتھ اپنا مہمان بنایا۔ شاہ صاحب علوم باطنی کے علاوہ علوم ظاہری میں بھی مہارت تامہ رکھتے تھے۔ اس لئے انہوں نے بہت سی کتابیں بھی تصنیف کیں۔ جن میں بعض کے نام یہ ہیں: ذخیرۃ الملوک: یہ کتاب شاہ ہمدان نے خاص طور سے شاہان کشمیر کے لئے لکھی تھی اور اس میں یہ بتادیا تھا کہ مسلمان بادشاہوں کو کس طرح حکومت کرنی چاہئے۔ رسالہ نوریہ، مکتوبات، حل المنصوص، شرح فص الحکم، رسالہ مصطلحات صوفیہ، شرح قصیدہ خمریہ،

[1] تاریخ اعظمی ص ۵۴ [2] ایضاً ص ۴۷ [3] ایضاً مطبوعہ غلام محمد نور محمد ۱۹۳۶ء۔

رسالہ مودۃ القربیٰ۔ منازل السالکین۔ اورادالفتحیہ۔ خلاصۃ المناقب۔ فضائل حضرت علیؓ۔ روضۃ الفردوس۔ علم القیافہ۔ دہ قاعدہ در مراقبہ۔ معرفت سیرت انسانی اور نظم میں چہل اسرار اور مجموعہ نظم۔

حضرت علامہ اقبالؒ آپ کی نسبت لکھتے ہیں[1]

سید السادات سالار عجم — دست او معمار تقدیر امم
تا غزالی درس اللہ ہو گرفت — ذکر و فکر از دودمان او گرفت
مرشد آن خطہ مینو نظیر — میر و درویش و سلاطین را مشیر
آفرید آن مرد ایران صغیر — با ہنرہائے غریب و دلپذیر[2]

حضرت سید علی ہمدانی رحمۃ اللہ علیہ کی شاعری کی گہرائی چہل اسرار سے نمایاں ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ وہ تصوف کے بلند مقام پر فائز تھے۔ جناب سید عشق کو ایک ایسی ہستی قرار دیتے ہیں جو انسان کو دنیا و ما فیہا سے الگ کرتی ہے۔ عاشق الٰہی اپنی دھن اور دولت سے فارغ ہوتا ہے اس کو بغیر وصال حق اور کوئی چاہت نہیں ہوتی۔

ای گرفتاران عشقت فارغ از مال و وصال — والہان حضرت را از خود جنت حلال
مقبلان کوئے شوقت را غلامی کردہ چرخ — سالکان راہ وصلت را دو عالم پائمال
عارفان وصف تو مغبوط اشراف ملک — مدبران در گہت سرگشتہ در تیہ ضلال

بہر حال ان کا سارا کلام تصوف اور معرفت کے سمندر میں ڈوبا ہوا ہے۔ حضرت سید علی کا اسلوب بیان نہایت پسندیدہ اور عارفانہ مطالب سے متعلق ہے، ان کے اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے

[1] شرح جاوید نامہ، مؤلفہ پروفیسر یوسف سلیم چشتی ص ۱۰۳۴ [2] جاوید نامہ اقبال مطبوعہ لاہور آب کوثر ص ۳۷۸
[3] تاریخ رشیدی میں لکھا ہے کہ حضرت سید نے کشمیر میں چالیس روز سے زیادہ قیام نہیں کیا اور تاریخ اعظمی کی نسبت یہ بیان
(آب کوثر)

باطن کی خوب سیر کی تھی اور تزکیہ نفس کے مقام پر پہنچ چکے تھے۔ عشق حق میں وہ اپنے آپ کو فنا کر چکے تھے۔ ان کا دل آتش عشق سے روشن ہو چکا تھا۔ وہ کسی کے دل کو دکھانا روا نہ سمجھتے تھے ہر کام میں وہ خدا پر نظر رکھتے تھے۔ سلاست اور صفائی ہر جگہ نمایاں ہیں۔

هر کہ بر خاک درست رہ یافت عزت یافت او — کز بیان وصف او فرسودہ شد ہر متعال
پیش محرومان ہجرت نیش نہ نوش پر شفا — تشنگان وصل را ہر آتشے چوں صد زلال

اس دور کے ایک اور فارسی شاعر سید ہلال تھے۔ آپ نقشبندیہ سلسلہ کے روحانی بزرگ تھے۔ سلطان سکندر کے زمانے میں تھے۔ آپ کا یہ شعر مشہور ہے ؎

از نقش تواں بسوئے نقاش شدن — این نقش غریب نقشبنداں دانند[۱]

اس دور کے ایک اور شاعر حاجی سید مراد شیخ اسحاق رومی کے مرید تھے۔ سلطان سکندر کے زمانے میں شعر و شاعری میں بلند مقام حاصل تھا، مگر افسوس ہے کہ آپ کے کلام میں سے صرف یہ شعر باقی رہا ہے[۲]

؎ نہ بیند در روز محشر گزند — غلامان شہ طاہری ارجمند

کشمیر میں فارسی علم و ادب کی توسیع و ترقی میں سب سے زیادہ کارنامہ سلطان زین العابدین کا ہے۔ وہ خود شاعر تھا اور فارسی نثر میں وہ دو[۳] کتابوں کا مصنف تھا[۴] ان کا تخلص قطب تھا۔ بعض تاریخوں میں زین العابدین کے یہ شعر ملتے ہیں :[۵]

اے بگرد شمع رویت عالمے پروانۂ — وز لب شیریں تو شور نسبت در ہر خانۂ
ماہ من گر میتوانی رحم کن بر بیدلاں — کز تو ماند این حکایت در جہاں افسانۂ
من بچندیں آشنائی میخورم خون جگر — آشنا را حال ایں است وای بر بیگانۂ

۱؎ نگارستان کشمیر ص ۲۸۰ ۲؎ ایضاً ۳؎ محب الحسن کشمیر انڈر سلطانز ص ۳۹۹ ۴؎ تاریخ حسن جلد دوم۔

گشتہ ام دیوانہ و جای ندارد خانہ ام — شب بکوی یار باشم روز در ویرانۂ
قطب مسکین گر گناہی میکند عیش مکن — عیب نبود گر گناہی می کند دیوانۂ

خواجہ محمد اعظم نے یہ اشعار سلطان قطب الدین کی طرف منسوب کئے ہیں[۱] بڈشاہ کا بیٹا جو کہ حیدر خاں کے لقب سے مشہور تھا، بھی شعر و شاعری کرتا تھا[۲] سلطان زین العابدین کے دربار کا ملک الشعراء علامہ احمد کشمیری تھا۔ شاعری اور تاریخ نویسی میں اس کو کمال حاصل تھا۔ محمد افضل کشمیری اس کا استاد تھا۔ ملا احمد مناظرہ و مباحثہ میں فرد کامل تھا۔ سلطان نے قدردانی فرماکر اپنے مصاحبوں میں داخل کر لیا۔ تاریخ وقایع کشمیر اور ترجمہ مہابھارت اس کی یادگار ہیں مرنے کے بعد مزار سلاطین میں جگہ پائی۔ ملا احمد عالم اور مصاحب قدیم ہونے کے علاوہ شاعر و ظریف بھی تھا۔ ایک دن بزم آراستہ تھی امراء و وزراء اپنی اپنی جگہ پر بیٹھے ہوئے تھے۔ بادشاہ سلامت تخت پر جلوہ افروز تھے کہ ملک الشعراء ملا احمد بھی دستار فضیلت کا شملہ پیشانی پر شاخ وار لٹکا کر جھومتا جھامتا اپنی جگہ پر آ بیٹھا۔ سلطان نے جو اپنے دربار کو ہر ملک اور ہر قسم کے لوگوں سے آراستہ رکھتا تھا مسکرا کر فی البدیہہ یہ شعر پڑھا ؎

شاخ پیشانی ملا احمد کشمیری ببیں — گر ندیدستی تو در آفاق انسان شاخوار

ملا احمد بھی خاموش رہنے والے نہ تھے۔ فوراً بول اٹھے : ؎

شاخ پیشانی خدیوا گر کہ داری داشتیم — تا نیایم در میان مادہ گاواں در شمار

وہ زمانہ عجیب تھا۔ لوگ بھی عجیب تھے۔ بادشاہ بہت خوش ہوا اور بہت سا انعام عطا کیا۔ حاسدوں سے زمانہ کبھی خالی نہیں رہا ہے۔ مولانا احمد بھی ان سے نہ بچ سکے۔ دربار سے ملک الشعراء کا خطاب ملا۔ حاسد اور بھی جل گئے، آخر کہہ سن کر بادشاہ کو ملا احمد سے برافروختہ کر دیا۔ بادشاہ نے

۱؎ کشمیر از محی الدین صوفی ۲؎ تاریخ حسن۔

ناراض ہوکر کشمیر سے باہر نکال دیا اور بے چارہ بیکسی میں آوارہ پھرتا رہا۔ مدت تک وہاں سرگرداں رہا۔ آخر یہ رباعی لکھ کر بادشاہ کی خدمت میں بھجوائی۔

نے بنجوم نہ مبتدا خبرے　　نے بہ منطق نہ جز و کل اثرے

برمن این کسر وجر چرا دانند　　احمد از غیر متفرق خوانند

سلطان نہایت خوش ہوا۔ مولانا کو واپس بلایا اور بیش از بیش انعام واکرام عطا کیا[1]۔ پنڈت رتناگر کی تاریخ رتناگر کا نسخہ بالکل نایاب تھا جو کلہن پنڈت کو بھی اپنی تاریخ لکھنے کے وقت باوجود کمال کوشش کے دستیاب نہ ہو سکا تھا۔ وہ نسخہ ملا احمد کو اس وقت ملا جب وہ اپنی تاریخ مکمل کر چکا تھا۔ تاہم اسے بطور دیباچہ اپنی تاریخ میں شامل کر دیا۔ نسخہ رتناگر میں جو سنسکرت زبان میں ہے ان راجاؤں کے حالات بھی درج ہیں جن سے کلہن پنڈت مطلق لاعلم رہا ہے اور اس لئے اپنی تاریخ میں ان کا ذکر ہی چھوڑ گیا تھا[2]۔ اس دور کے ایک اور اہم شاعر جناب سید محمد امین منطقی سید حسین کے بیٹے تھے۔ ان سے بہت سے کشف وکرامات مشہور ہیں۔ سلطان زین العابدین نے آپ کو متبنیٰ بنا لیا تھا۔ مگر انہوں نے ہمیشہ بادشاہ کی مصاحبت سے کنارہ کشی اختیار کی۔ اکثر امراء ان کے جانی دشمن ہو گئے تھے اور انہوں نے موقع پا کر انہیں شہید کر دیا[4]۔

یہ بابا میر اویس کے نام سے مشہور ہوئے۔ شاعر بھی تھے اور اویسی تخلص تھا۔ ان کی یہ رباعی مشہور ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ صوفیوں کا مذہب کیا ہوتا ہے[3]

بہ پیش مردم عارف چہ مسجد وچہ کنشت　　بچشم اہل نظر خوب و زشت یکساں است

اگر ز مذہب وملت بپرسی از اویسی　　بدیں عشق سرخیل حق پرستان است

---

[1] تکمیل تاریخ کشمیر از محمد الدین فوق [2] ایضاً ص ۷، ۵ [3] نگارستان کشمیر ص ۲۸۰۔

گناہ ما ز عدم گر نیامدے بوجود　　وجود عفو تو در عالم عدم بودے

مرنے سے پہلے یہ دو شعر ان کی زبان پر جاری تھے[1]

من فارغم ز مصلحت اہل روزگار　　نہ میدان یقین کہ کشش من بیت بیگنا

اکنون بیا و شعر بخواں بر مزار من　　تا روئے ظالمان ستمگر شود سیاہ

اس کے علاوہ سلطان زین العابدین کے زمانے میں مندرجہ ذیل شعراء ہو گزرے ہیں:

ملا قدیمی۔ ملا فصیحی۔ ملا ملحی۔ ملا جمیل۔ ملا احمد رومی۔ ملا محمد رومی۔ ملا نور الدین۔ ملا علی شیرازی۔ ملا قادری اور مولانا حسین غزنوی[2]۔

اس کے بعد ہمیری خاندان پر زوال کے آثار ظاہر ہوئے۔ مورخ حسن فرماتے ہیں:

"بعد سلطان زین العابدین قریب یکصد سال بسبب فساد وعناد امرا دریں محال ہرج ومرج بوقوع آمدہ۔ ہیچ کسے پرداخت ایں عالم نہ نمود"[3]

---

[1] نگارستان کشمیر ص ۲۸۰ [2] تاریخ حسن ج ۲ ص ۲ [3] ایضاً

مآخذ

۱۔ تاریخ حسن جلد دوم ۲۔ تاریخ حسن جلد چہارم ۳۔ تکمیل تاریخ کشمیر جلد دوم از محمد الدین فوق ظفر برادرس لاہور ۴۔ تذکرہ شعرائے کشمیر از حسام الدین راشدی۔ اقبال اکاڈمی کراچی ۵۔ نگارستان کشمیر ۶۔ آب کوثر از اکرام ۷۔ کشمیر جلد دوم پنجاب یونیورسٹی لاہور ۸۔ کشمیر انڈر سلطانز از محب الحسن ۹۔ چہل اسرار از سید علی ہمدانی مرتبہ میر اکبر فاروق اینڈ کو ۱۰۔ شرح جاوید نامہ از سلیم چشتی لاہور ۱۱ ۱۹۵۷ء ۱۱۔ جاوید نامہ اقبال شیخ مبارک علی لاہور ۱۹۵۷ء ۱۲۔ جامع شواہد از زاہد ۱۳۔ جامع الکمالات از سعادت کشمیری ۱۴۔ تذکرہ شعرائے کشمیر از مرزا اصلح مرتب راشدی ۱۵۔ رموز عشق از ڈاکٹر میر ولی الدین ندوۃ المصنفین جامع مسجد دہلی ۱۶۔ تاریخ ریاست جموں وکشمیر ایک نظر از پروفیسر حسن شاہ ۱۷۔ مختصر تاریخ کشمیر از سیف الدین پنڈت مترجمہ جناب محمد امین پنڈت ۱۹۶۲ء ۱۸۔ مسلم رول ان کشمیر از ڈاکٹر پاروو ۱۹۔ تاریخ کبیر کشمیر از محی الدین مسکین ۲۰۔ تاریخ واقعات کشمیر از خواجہ محمد اعظم دیدہ مری۔

معارف کی ڈاک

سلی گوڑی

۱۰ اپریل سنہ ۲۰۰۱ء

برادر مکرم جناب ضیاء الدین اصلاحی صاحب! سلام علیکم

گرامی نامہ صادر ہوا۔ آپ کے ہمدردی بھرے الفاظ نے دل کے زخموں پر مرہم کا کام کیا۔

میں لکھنؤ چھوڑنے سے زیادہ سلی گوڑی آنے سے پریشان تھا اس لیے کہ اس وقت میری معلومات کے مطابق یہ ایک ایسی جگہ تھی جہاں مسلمان تقریباً نہ ہونے کے برابر تھے ہم زبانوں کا کیا سوال۔ یہاں آکر یہ تو معلوم ہوا کہ حالات اس حد تک خراب نہیں ہیں۔ مسلمان تقریباً پانچ چھ فیصدی ہیں لیکن بہت ہی پس ماندہ اور غریب۔ سنا تھا کہ شہر میں کل دو مسجدیں ہیں، لیکن اب تک یہاں آکر چار مسجدوں کا علم ہوا ہے۔ ایک میرے قیام گاہ کے قریب ہی ہے۔ چھپر کا ایک ہال بنادیا گیا ہے اور وہی مسجد ہے۔ گذشتہ جمعہ کو اسی میں نماز ادا کی تھی۔ تین صفوں بھر نمازی تھے۔ اس کے علاوہ ایک چھوٹی مسجد خاص بازار کے علاقے میں ہے جس کی توسیع کردی گئی ہے اور چار منزلیں بن گئی ہیں۔ یہی شہر کی جامع مسجد ہے۔ یہاں آنے کے بعد پہلے جمعہ کو یہاں ہی نماز ادا کی تھی۔

یہاں اگرچہ ہم نفس نہیں ہیں لیکن قدرت نے دلچسپی کا سامان مہیا کردیا ہے۔ سلی گوڑی سے چند ہی کلو میٹر دوری پر جنگلوں اور پہاڑوں کا سلسلہ نظر آتا ہے۔ ان جنگلوں میں کچھ بہت ہی خوب صورت مقامات ہیں۔ چنانچہ یہاں آنے کے چند روز بعد ہی تقریباً چالیس

کلو میٹر دوری پر چائے کے باغوں (کھیتوں کہنا زیادہ مناسب ہے) اور جنگلوں کے درمیان جنگلی جانوروں کی پناہ گاہ ہے جس میں اندازاً ۳۶ گینڈے، ۵۰ جنگلی ہاتھی، ارنا بھینسے اور دیگر جانور ہیں۔ قابل دید جگہ ہے۔

یہاں سے تقریباً ساٹھ کلو میٹر کے فاصلے پر ایک ڈیڑھ دو لاکھ آبادی کا شہر CAL IM PONG کیلم پانگ ہے۔ پہاڑ کی ڈھال پر آباد ہے اور دارجلنگ سے خوبصورت ہے اس شہر میں بھی ایک مسجد نظر آئی۔

قدرت کے ہر کام میں مصلحت ہوتی ہے۔ شاید یہاں بھیجنے میں خدا کی مصلحت مجھے اپنی قدرت کا مشاہدہ کرانا تھا۔ گذشتہ اتوار کو سکم گیا تھا۔ اس کا دارالحکومت GAN-G TOCT گیانگ ٹاکٹ پہاڑ کی ڈھال پر نہایت قرینے سے بسایا گیا ہے۔ یہ پانچ چھ منزلہ عمارتوں کا تقریباً پانچ لاکھ آبادی کا شہر میرے خیال میں ہندوستان کا خوبصورت ترین اور صاف ستھرا شہر ہے۔ یہاں بھی ایک مسجد نظر آئی۔ قدرت کے حسین ترین مناظر گیانگ ٹاک کے بعد شروع ہوتے ہیں۔ یہ شہر ساڑھے پانچ ہزار فٹ کی بلندی پر ہے۔ مسلسل چڑھائی چڑھنے کے بعد ایک بہت ہی خوب صورت جھیل TSOMG OLAKE پڑتی ہے جس کے کنارے پہاڑ کی پوری ڈھال آج کل بھی برف سے ڈھکی ہوئی نظر آئی۔ یہ جگہ تقریباً ۱۲ ہزار فٹ بلندی پر ہے اور یہ پورا علاقہ چھانگو کہلاتا ہے یہ جھیل مئی تک منجمد رہتی ہے۔ یہاں ایک چھوٹا سا بازار ہے اور بیل کی قسم کا ایک جانور یاک جس کا ذکر جغرافیہ کی کتابوں میں پڑھا تھا یہاں نظر آیا۔

چھانگو جھیل کے بعد ہندوستان اور چین کا سرحدی علاقہ شروع ہو جاتا ہے اور اکثر جگہ بورڈ نظر آتے ہیں کہ یہاں آپ کو چینی دیکھ رہے ہیں۔ یہ پر پیچ اور حسین ترین چاروں طرف

برف سے ڈھکا راستہ ایک مقام ناتھولا تک جاتا ہے جو چین اور ہندوستان کی سرحد ہے ساڑھے چودہ ہزار فٹ کی بلندی پر یہ برف زار گاڑیوں کی آخری منزل ہے۔ اس کے بعد کچھ دور پیدل چڑھا جاتا ہے۔ ساڑھے چودہ ہزار فٹ کی بلندی پر چاروں طرف چاندی کے پہاڑوں پر اصل سرحد ہے جہاں ایک طرف ہندوستانی سپاہی اور دوسری طرف چینی فوجی موجود رہتے ہیں۔ آج کل کے موسم میں بھی اتنی سرد ہوائیں اور ایسی زبردست ٹھنڈک تھی جس کا تجربہ کشمیر کے پچاسوں چکروں میں بھی نہ ہوا تھا۔ خیال کرتا ہوں کہ جب سترہ ہزار فٹ بلندی پر یہ حال ہے تو کارگل اور سیچین جو اس سے بھی زیادہ بلند مقامات ہیں وہاں کیا حال ہوگا یہ خوب صورت مقامات خدا نے اپنی قدرت کے مظاہرہ کے لئے بنائے ہیں جہاں ایسا سکون مل سکتا ہے جس سے زندگی میں اضافہ ہو اور اسی لئے ہمارے ملک کے سناسیوں نے انہیں اپنی قیام گاہ کے لئے منتخب کیا تھا، لیکن انسانوں نے انہیں موت کا مسکن بنا دیا ہے۔ اس سے زیادہ انسانیت کی توہین کیا ہوگی۔ چھانگو اور نتھولا کے پاس کی خوبصورتی الفاظ میں بیان نہیں کی جا سکتی۔ اس گرمی کے موسم میں بھی پہاڑ مکمل طور سے برف سے ڈھکے ہوئے ہیں۔

سکم میں صرف نتھولا ہی ایک قابل دید مقام نہیں ہے بلکہ اور جگہیں بھی ہیں، لیکن وہاں تک رسائی مشکل ہے۔

خط بہت طویل ہوگیا ہے۔ آپ کی اور زیادہ سمع خراشی نہیں کرنا چاہتا۔ بینائی کی کمی بڑھتی جا رہی ہے جو کچھ باقی ہے وہ شاید خدا نے اپنی قدرت دکھانے کے لئے باقی رکھا ہے۔ لکھنے پڑھنے کی غیر موجودگی میں صرف شعر گوئی ایک مشغلہ رہ گیا ہے۔ چنانچہ فارسی کی ایک سہ غزلہ حاضر خدمت ہے۔ شاید پسند آئے۔

خدا حافظ

محمد ولی الحق انصاری

حبیب منزل، میرس روڈ، علی گڑھ۔

۲۷-۳-۲۰۰۱ء

مکرمی و محترمی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ

لکھنؤ سے کل ۲۵ مارچ کا جدید مرکز آیا تو اس میں محمد امین مسعود صدیقی صاحب کی اچانک وفات کی خبر پڑھ کر دلی صدمہ ہوا، اخبار میں اس خبر کی سرخی "مولانا آزادؒ کے عاشق تھے مسعود صدیقی" چھپی ہے اور اس سے بہتر سرخی کوئی اور نہیں ہو سکتی تھی۔ کیا عجیب عشق تھا کہ چاہتے تھے ہر فرد، ہر اخبار اور رسالہ اور ہر ادارہ اس عشق میں ان کا شریک ہو جائے۔ ہر ممکن طریقے سے مولانا آزادؒ کے پیغام کی اشاعت کے لئے سرگرداں رہتے تھے۔

ان میں اور بھی بہت سی خوبیاں تھیں، بہت دین دار، مخلص، متحرک اور بے نفس انسان تھے، میرا بہت لحاظ کرتے تھے۔ میں کسی معاملے میں ان سے اختلاف کرتا تھا تو خاموش ہو جاتے تھے، کبھی بحث نہیں کرتے تھے۔ مولانا آزادؒ پر کہیں کوئی چیز ان کی نظر سے گزرتی تھی تو اس کی فوٹو کاپی مجھے بھیج دیتے تھے۔ میں لکھنؤ جاتا تو انہیں مطلع کر دیتا اور میرا جہاں کہیں قیام ہوتا وہ وہاں آکر مجھ سے ضرور ملتے تھے۔ مجھے ان کا آخری خط جو ۲۵ فروری کا لکھا ہوا تھا ۲۸ کو ملا تھا۔ اس میں انہوں نے لکھا تھا: "معارف کا فروری ۲۰۰۱ء کا شمارہ آپ کو مل گیا ہوگا۔ اس میں اس ناچیز کا ایک مراسلہ شایع ہوا ہے۔ اس مراسلے پر حواشی میں جو باتیں تحریر فرمائی گئی ہیں۔ اس (کذا) سے نفس کی اصلاح کا موقع ملا ہے"۔ ملاحظہ فرمایا آپ نے کس طرح اپنی کوتاہی کا اعتراف کیا ہے۔ میں نے کچھ غلط تو نہیں لکھا کہ کیسے بے نفس انسان تھے۔ اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے اور درجات بلند کرے۔

بہت جلدی چلے گئے۔

امید ہے آپ کا مزاج بفضلہ بعافیت ہوگا۔ نیازمند

ریاض الرحمٰن شروانی

معارف: محمد امین مسعود صدیقی مرحوم سے راقم کے بھی مخلصانہ تعلقات تھے، میں بھی لکھنؤ جاتا تو وہ ملاقات کے لئے ضرور تشریف لاتے اور مجھے کہیں جانا ہوتا تو اپنے اسکوٹر سے پہنچا دیتے۔

مولانا آزاد اور دوسرے مسائل کے تعلق سے اخباروں کے تراشے مجھے بھی بھیجتے تھے۔ مولانا آزاد پر میری حقیر کتاب انہی کے اصرار سے چھپی تھی اور ان کی تحریک سے اس کے مصارف گاندھی۔ آزاد فورم نے برداشت کئے تھے۔

مولانا آزاد کے وہ واقعتاً عاشق و شیدائی تھے، ان کے خلاف کچھ سننا پسند نہیں کرتے تھے، مکتوب بالا میں ان کے جس مراسلے کا تذکرہ ہے اسے بھیجنے کے بعد ٹیلی فون سے اس کی وصولی کے بارے میں دریافت کیا تھا، میں نے انہیں بتایا کہ انشاء اللہ آپ کا مراسلہ فروری کے شمارے میں میرے نوٹ کے ساتھ کسی قدر قطع و برید کے بعد شایع ہوگا، مجھے ان کے ردعمل کا انتظار تھا کہ ۱۹ مارچ ۲۰۰۱ء کے راشٹریہ سہارا اردو میں ان کے انتقال کی خبر پڑھی اور تڑپ کر رہ گیا۔ اخبار میں ان کا نام صحیح نہیں لکھا تھا، ڈوبتے کو تنکے کا سہارا۔ اسی وقت ان کو یہ خط لکھا کہ "اپنی خیریت سے فوراً مطلع فرمائیں"۔ آپ کے والا نامہ سے یہ امید بھی ختم ہوگئی اور اب اپریل کے آخری ہفتے میں ان کی والدہ ماجدہ کا یہ پوسٹ کارڈ ملا کہ "میں والدۂ مسعود بہت دکھ کے ساتھ اطلاع دے رہی ہوں۔ ۷ مارچ کو اچانک مسعود کا انتقال ہوگیا"۔

اللہ تعالیٰ مرحوم کو اپنے آغوش رحمت میں جگہ دے اور ان کی بوڑھی ماں اور دوسرے عزیزوں کو صبر جمیل عطا کرے آمین!!

وفیات

جناب کالی داس گپتا رضا

افسوس ہے کہ اردو کے مشہور محقق اور غالبیات کے ماہر جناب کالی داس گپتا رضا ۲۱ مارچ ۲۰۰۱ء کو چل بسے، وہ راشٹرپتی بھون میں اعزازات کی تقریب میں شرکت کے لئے دلی تشریف لائے تھے اور ہوٹل میں قیام پذیر تھے کہ اچانک دل کا شدید دورہ پڑا، وہاں سے اسپتال جارہے تھے کہ راستے ہی میں انتقال ہوگیا۔

کالی داس صاحب ۲۵ اگست ۱۹۲۵ء کو مکند پور ضلع جالندھر (پنجاب) میں پیدا ہوئے۔ بچپن میں ہی طبیعت شعر و سخن کی طرف راغب ہوگئی تھی اور تلمیذ داغ پنڈت لبھو رام جوش ملسیانی سے کلام پر اصلاح لینے اور مشورۂ سخن کرنے لگے، میٹرک پاس کرنے کے بعد وہ کاروباری سلسلے میں نیروبی (جنوبی افریقہ) چلے گئے، لیکن اردو زبان کی محبت گھٹی میں پڑی ہوئی تھی۔ اسی زمانے میں پنجاب یونیورسٹی کے امتحانات منشی کامل و منشی فاضل اور سینیر کیمبرج بیرسٹری کے امتحانات دئے، ان کی تعلیم زیادہ نہیں تھی مگر اپنی محنت و مطالعہ سے انہوں نے نصابی تعلیم کی کمی کی پوری تلافی کرلی تھی۔

گپتا رضا صاحب افریقہ سے واپسی کے بعد بمبئی میں متوطن ہوگئے تھے، کاروباری مصروفیات کے باوجود علم و فن، شعر و ادب اور تحقیق و تنقید کو وہ اپنا اوڑھنا بچھونا بنائے رہے، تحقیق سے ان کو عشق تھا، غالبیات ان کی دلچسپی کا خاص موضوع تھا، اس کے ماہرین میں شمار کئے جاتے تھے، نو دس گھنٹے روزآنہ وہ تحقیق اور مطالعۂ کتب میں گزارتے، ان کے ذاتی

کتب خانے میں چالیس ہزار سے زیادہ کتابیں اور رسالے تھے۔ مخطوطات سے بڑا شغف تھا کوئی مخطوطہ مل جاتا تو ہر قیمت پر اسے خرید لیتے۔ ان کے کتب خانے میں پانچ سو سے زیادہ قلمی کتابیں تھیں، غالبیات پر اتنا بڑا ذخیرہ اور کسی کتب خانے میں نہیں ہوگا۔

گپتا رضا صاحب کی تصنیفات کی تعداد تیس سے زیادہ ہے جن میں تقریباً دو درجن غالبیات سے متعلق ہیں، آٹھ شعری مجموعے ہیں، چکبست اور جوش ملسیانی پر بھی ان کا تحقیقی کام ہے، غالبیات میں ان کی نت نئی تحقیقات سے اردو کے ذخیرے میں برابر اضافہ ہو رہا تھا، ان کا ایک بڑا کارنامہ دیوان غالب کامل کی ترتیب و تدوین ہے جس میں انہوں نے غالب کے اردو کلام کو بہ لحاظ زمانہ ترتیب دیا ہے۔ اردو کے اکثر معیاری اور بلند پایہ رسالوں میں ان کے مضامین برابر شایع ہوتے تھے کبھی کبھی معارف بھی ان کی نگارشات سے مزین رہتا تھا، مجھے اپنے کرم ناموں سے بھی مفتخر فرماتے تھے۔

گپتا رضا صاحب نے اپنے گوناگوں علمی و تحقیقی کارناموں کی بنا پر پوری اردو دنیا میں بڑی شہرت، عزت، نیک نامی اور مقبولیت حاصل کی اور وہ اردو کے صف اول کے دانشوروں اور محققوں میں شمار ہوتے تھے، اردو کا بڑا سے بڑا ادبی اعزاز انہیں تفویض کیا گیا، اکثر اکادمیوں نے انعامات سے نوازا، ۸۹ء میں غالب ایوارڈ ملا، دو برس پہلے مجلس فروغ اردو قطر کی جانب سے اس کا سب سے بڑا ادبی ایوارڈ دیا گیا، اس سال یوم جمہوریہ کے موقع پر حکومت ہند کی طرف سے ان کی ادبی خدمات پر پدم شری کے اعزاز دئے جانے کا اعلان ہوا تھا جسے لینے کے لئے دہلی گئے تھے کہ وقت موعود آگیا، معارف ان کے پس ماندگان کے غم میں برابر کا شریک ہے۔

پروفیسر نجم الاسلام

پروفیسر نجم الاسلام ۱۳؍ فروری ۲۰۰۱ء کو لطیف آباد سندھ حیدرآباد میں وفات پاگئے۔

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ۝

مرحوم کی پیدائش ۱۹۳۳ء میں بجنور میں ہوئی تھی۔ میرٹھ کالج سے بی۔ اے کیا اور یہیں سے حفیظ میرٹھی وغیرہ کے اشتراک سے "معیار" کے نام سے ایک ادبی ماہنامہ نکالا جس نے چند برسوں کے بعد دم توڑ دیا مگر تعمیری ادب کے نقوش چھوڑ گیا۔ انہوں نے اس میں چھپنے والے افسانوں اور ڈراموں کا ایک انتخاب "ابھرتی کرنیں" کے نام سے شائع کیا تھا۔

پاکستان جانے کے بعد انہوں نے سندھ یونیورسٹی سے ایم۔ اے کیا اور "شمالی ہند کی قدیم اردو نثر" کے موضوع پر اردو فارسی کے مشہور فاضل اور ممتاز محقق پروفیسر ڈاکٹر غلام مصطفیٰ کی نگرانی میں ڈاکٹریٹ کا مقالہ لکھا، ان کے ریٹائر ہونے کے بعد نجم الاسلام صاحب شعبۂ اردو کے سربراہ مقرر ہوئے۔

سندھ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کی جانب سے ۱۹۶۱ء میں انھوں نے "صریر خامہ" کے نام سے ایک ادبی مجلہ جاری کیا، ۸۷ء میں ان کی ادارت میں اسی شعبہ سے ایک معیاری اور بلند پایہ مجلہ "تحقیق" نکلا، جس نے ہندوستان و پاکستان کے بعض ممتاز محققین کے گوشے بھی شائع کئے، اس مجلہ میں راقم اپنے بعض پرانے مضامین دیکھ کر دنگ رہ گیا کہ وہ کہاں کہاں سے ڈھونڈ ڈھونڈ کر مضامین شائع کرتے تھے۔

خدا کرے یہ بلند پایہ مجلہ ان کے بعد بھی جاری رہے مرحوم کی کئی کتابیں بھی چھپی ہیں "مطالعات" ان کے تحقیقی مضامین کا مجموعہ ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں غریق رحمت کرے آمین!

"ض"

علامہ محمد بن صالح العثیمین

پچھلی صدی عیسوی کا اختتام عالم اسلام کی متعدد مایہ ناز شخصیات کی المناک وفات پر ہوا تھا، علامہ عبدالعزیز بن باز، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، شیخ ناصر الدین البانی اور شیخ محمد عمر فلاتہ جیسے آسمان علم و فضل کے آفتاب و ماہتاب اس کے گہن میں چھپ گئے تھے۔ اب اس صدی کا آغاز بھی ایک متواضع، منکسر المزاج اور درویش عالم کی اندوہ ناک وفات سے ہوا، جو علمی حلقوں میں ابن عثیمین کے نام سے مشہور و متعارف تھے۔

مرحوم سعودی عرب کے ایک قدیم معزز خاندان کے چشم و چراغ تھے، صوبہ قصیم کے شہر عنیزہ میں ان کی ولادت ہوئی، شیخ عبدالرحمن السعدی اور مشہور مفسر شیخ محمد امین شنقیطی سے اکتساب فیض کیا، شیخ السعدی ان کے ہم وطن اور ان کے ابتدائی استاد تھے اس لئے وہ ان سے زیادہ متاثر ہوئے اور ان کے انتقال کے بعد ان کے علمی جانشین مقرر ہوئے۔

مدۃ العمر عنیزہ میں تدریس، وعظ و ارشاد اور تصنیف رسائل میں مشغول و منہمک رہے، سعودی عرب میں شیخ ابن باز کے انتقال کے بعد علماء اور طلبۂ علوم دینیہ کا مرکز وہی بن گئے تھے، مگر شیخ ابن باز کی جدائی ان کو گوارا نہ ہوئی، ان کی وفات کو ابھی دو برس بھی نہیں گزرے تھے کہ شیخ عثیمین نے بھی رخت سفر باندھا اور ان سے افادہ و استفادہ کا سلسلہ موقوف ہوگیا۔

جدہ کے ایک اسپتال میں ان کا انتقال ہوا، مکہ مکرمہ میں ان کی نماز جنازہ پڑھی گئی اور مقبرۃ العدل میں شیخ ابن باز کے پہلو میں مدفون ہوئے۔ تقریباً پانچ لاکھ نفوس نے ان کے جنازہ کی مشایعت کی جن میں سربراہان مملکت بھی شامل تھے جو ان کی مقبولیت کا بین ثبوت ہے۔

علامہ مرحوم بڑے خلیق، متواضع اور سادگی پسند شخص تھے، انہوں نے کبھی بھی دنیا کی آرائش و زیبائش کی طرف مڑ کر نہیں دیکھا، ہمیشہ درس و تدریس، وعظ و افتاء اور تصنیف و تالیف سے سروکار رکھا، سرکاری مناصب کی پیشکش بھی ہوئی تو انہوں نے اپنے محبوب مشغلہ تدریس سے جدا ہونا پسند نہیں کیا، ان کی وفات صرف ایک ملک کا سانحہ نہیں ہے بلکہ پوری دنیائے علم کا ناقابل تلافی خسارہ ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے۔ آمین!!

ع۔ ع۔

باب التقریظ والانتقاد

رسالوں کے خاص نمبر

سہ ماہی فکر اسلامی بستی مولانا ابوالحسن علی ندوی نمبر، مرتبہ مولوی محمد اسعد قاسمی صاحب، تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۲۸۰، قیمت سالانہ ۱۰۰ روپے، قیمت خاص نمبر ۵۰ روپے، ناشر: دارالعلوم الاسلامیہ بستی۔ یو۔پی

مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کا آوازۂ شہرت عرب و عجم ہر جگہ بلند تھا اور وہ مسلمانوں کے ہر طبقہ و مسلک میں مقبول و محبوب تھے، ان کی مقبولیت اور ہر دلعزیزی کی بناپر ابھی تک ان کا ماتم بپا ہے اور ان کی وفات کے بعد ہی سے اخباروں اور رسالوں نے ان پر خاص نمبر شائع کرنے کا جو سلسلہ شروع کیا تھا وہ ابھی تک منقطع نہیں ہوا ہے لیکن معیاری اور مولانا کے شایان شان نمبر کم نکلے ہیں۔ دارالعلوم الاسلامیہ بستی سے مولانا کو اور اس کے ذمہ داروں کو مولانا سے خاص تعلق تھا، اس لئے اس نے بھی جذبۂ احسان مندی سے سرشار ہو کر یہ خاص نمبر نکالا ہے جو اور نمبروں سے اچھا، بہتر اور صوری و معنوی دونوں حیثیتوں سے پرکشش ہے۔ اس کا آغاز مولانا کے جانشین مولانا سید محمد رابع اور بانیٔ مدرسہ مولانا محمد باقر حسین کے پیغام سے ہوا ہے، پھر مولانا کی سیرت و شخصیت اور زندگی کے عنوان سے ۹ مضامین دئے گئے ہیں، جن میں مولانا سید سلمان حسینی کا مضمون "مولانا کی شخصیت کے عناصر ترکیبی" خاص طور پر قابل مطالعہ ہے، پہلے مضمون "ماہ و سال کے آئینے میں" مولانا کے دارالمصنفین، شبلی اکیڈمی سے تعلق اور

اس کی اہم تقاریب میں ان کے نمایاں حصہ کا تذکرہ نہیں ہے، دوسرے حصہ میں مولانا کے امتیازات وخصائص زیر بحث آئے ہیں، یہ حصہ سات مضامین پر مشتمل ہے، پہلا مقالہ مولانا عتیق احمد بستوی کے قلم سے بہت خوب ہے، تیسرے حصہ کے آٹھ مضامین میں مولانا کے علمی ودینی کمالات اور تصانیف کا جائزہ ہے، تفسیر وحدیث اور فقہ سے ان کی مناسبت دکھائی گئی ہے اور ان کے عربی کے صاحب طرز ادیب ہونے کا ذکر ہے، اس حصہ کا آخری مضمون سید صباح الدین عبدالرحمن مرحوم کا ہے جس میں ان کی تصانیف کا منفرد اور نرالے انداز سے تعارف کرایا گیا ہے، یہ مولانا کو شاہ فیصل ایوارڈ دیے جانے کے وقت معارف کے شذرات میں لکھا گیا تھا، چوتھے حصے میں وہ مضامین شامل ہیں جن میں اشخاص، اداروں اور تحریکوں سے مولانا کا تعلق دکھایا گیا ہے، پانچویں حصے میں تاثراتی تحریریں اور چھٹے میں مجلات وجرائد کے وہ مضامین درج ہیں جو مولانا کے انتقال کے بعد ان میں شائع ہوئے تھے، ساتویں اور آخری حصے میں منظوم خراج عقیدت ہے، اس اچھے نمبر کی اشاعت پر فاضل مرتب توصیف وستائش کے مستحق ہیں۔

سہ ماہی اردو ادب
سردار جعفری خطوط نمبر

اڈیٹر جناب اسلم پرویز، تقطیع متوسط کاغذ کمپوزنگ طباعت بہتر، صفحات ۲۴۰، قیمت ۶۰ روپے، عام شمارہ ۳۰ روپے، سالانہ ۱۰۰ روپے، پتہ: انجمن ترقی اردو (ہند) اردو گھر، ۲۱۲، راؤز ایونیو، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲۔

سہ ماہی اردو ادب انجمن ترقی اردو ہند کا معیاری اور بلند پایہ ادبی، تنقیدی اور تحقیقی رسالہ ہے، اس کا زیر نظر شمارہ سردار جعفری کے خطوط نمبر ہے، سردار جعفری اردو کے قد آور شاعر وادیب اور ترقی پسند تحریک کے سالار کارواں تھے، ان کی زندگی اردو کی خدمت، اس کے مسائل کی گتھیاں

سلجھانے، شعر وادب کو فروغ دینے اور ترقی پسند تحریک کو تب وتاب بخشنے میں گزری، ان خطوط میں اس کی پوری جھلک دکھائی دیتی ہے، اس لحاظ سے یہ خطوط جعفری صاحب کے حالات زندگی، ان کی شخصیت، فن، ادبی وتنقیدی نظریات اور گزشتہ نصف صدی کی اردو اور ترقی پسند تحریک کا دستاویزی مرقع ہیں، ان میں اردو کے ساتھ حکومت کی بے اعتنائی اور سرد مہری بھی زیر بحث آگئی ہے، اردو وفارسی کے واقف کار سابق وزیر اعظم نرسمہا راؤ کی اردو دشمنی کا جو ذکر خطوط میں اشارتاً تھا، خطوط کے مقدمہ نگار ڈاکٹر خلیق انجم نے اس کا مفصلاً تذکرہ کیا ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس بارے میں بھی بابری مسجد کے انہدام کی طرح نرسمہا راؤ کی تصویر بڑی بھیانک اور نہایت گھناؤنی ہے۔ خطوط میں قلم برداشتہ لکھے جانے کی وجہ سے بڑی بے ساختگی و برجستگی ہوتی ہے اور وہ مکتوب نگار کی زندگی، اس کی سیرت وشخصیت اور اس کے افکار وخیالات کا آئینہ ہوتے ہیں اسی لئے وہ ذوق وشوق سے پڑھے جاتے ہیں، سردار جعفری کے خطوط بھی اس کا نمونہ ہیں اور وہ اردو زبان، ترقی پسند تحریک اور خود سردار جعفری کی زندگی سے متعلق گوناگوں معلومات پر مشتمل ہیں، اس مجموعہ میں خوردوں کے نام کے خطوط سے ان کی اصلاح وتربیت کا انداز معلوم ہوتا ہے۔ یہ مجموعہ دو درجن اشخاص کے نام تقریباً دو سو خطوط پر مشتمل ہے، کچھ اہم مکتوب الیہم کے نام یہ ہیں: پروفیسر جگن ناتھ آزاد، پروفیسر گیان چند جین، ڈاکٹر راج بہادر گوڑ، جناب سید شہاب الدین دسنوی، جناب مظہر امام، پروفیسر زاہدہ زیدی، پروفیسر سید محمد عقیل رضوی، رام لعل، نیر مسعود، عمیق حنفی، خواجہ احمد عباس، پروفیسر عبدالقوی دسنوی وغیرہ، سب سے زیادہ خطوط پروفیسر سید عقیل رضوی کے نام ہیں، آخر میں توضیحی حواشی اور ناموں کے اشاریے دیے گئے ہیں۔

"ض"

مطبوعات جدیدہ

حیات ابوالکلام آزاد از جناب پروفیسر عبدالقوی دسنوی، متوسط تقطیع، اعلیٰ کاغذ و طباعت اور عمدہ کتابت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۹۱۲، قیمت ۹۰۰ روپے،

پتہ: موڈرن پبلشنگ ہاؤس، ۹۔ گولا مارکیٹ، دریا گنج، نئی دہلی۔

اس ضخیم کتاب کے فاضل مصنف مولانا ابوالکلام آزاد اور ان کے افکار و خیالات اور طرز تحریر و تقریر کے عاشق و شیدائی ہیں، مولانا کے متعلق ان کی نو کتابیں شائع ہو چکی ہیں اس طرح زیر نظر کتاب گویا عشرہ کاملہ ہے جس کی تالیف کا سبب یہ احساس تھا کہ مولانا مرحوم کے شایان شان ایک مفصل سوانح حیات کی ضرورت اب بھی باقی ہے، مولانا آزاد نے مولانا غلام رسول مہر کے نام ایک خط میں لکھا تھا کہ "لوگ --- میرے حالات زندگی نہیں لکھ سکتے، صحیح وقت اس کا میرے بعد آئے گا، کیوں نہ اس کا انتظار کیا جائے؟" مولانا مرحوم کے انتقال کے قریب پچاس سال بعد کہا جا سکتا ہے کہ اس کتاب کی اشاعت سے اس کا صحیح وقت آیا، سخت محنت و تحقیق اور دستیاب و کمیاب و نایاب مراجع و مصادر کے وسیع مطالعہ کے بعد گذشتہ صدی کے نصف اول کی ہشت پہل اور نابغہ روزگار شخصیت کے ہر پہلو کا احاطہ اس سلیقے سے کیا گیا ہے کہ انگریزوں کے زمانہ عروج و زوال میں ہندوستان خصوصاً اسلامیان ہند کی تاریخ مرتب ہو گئی ہے، جس کا ہر نقش عبرت و نصیحت کی تصویر ہے، اس حیات آزاد کو سنین کے لحاظ سے پانچ حصوں یعنی ۱۸۸۸ء تا ۱۹۱۲ء، ۱۹۲۰ء، ۱۹۲۹ء اور ۱۹۴۷ء میں تقسیم کیا گیا ہے، اس ترتیب سے پیدائش سے وفات تک کی داستان

مسلسل و مربوط اور گویا متحرک و محسوس شکل میں سامنے آ جاتی ہے، فاضل مصنف نے اپنے خیالات کے اظہار سے حتی الامکان گریز کیا ہے اور واقعات کو اصل اور صحیح شکل میں دیکھنے کے لئے اقتباسات کو بہتر ذریعہ سمجھا ہے، اس سے اقتباسات کی کثرت اور طوالت غیر معمولی ہو گئی ہے، اس میں احتیاط کی جاتی تو کتاب زیادہ سڈول اور اس کی تاثیر زیادہ قوی ہوتی مثلاً جمعیت دعوت و تبلیغ اسلام میں تین صفحات کے مکمل خط کی بجائے صرف یہ اقتباس شاید کافی ہوتا کہ "جماعت اہل حدیث کی تنظیم کے حالات پر نظر ڈالتا ہوں تو یہ مختصر بھی مطول سے کم مشکل نہیں، بڑی مصیبت یہ ہے کہ جماعت اہل حدیث بھی اپنے اصل ذوق اور ذہنیت سے ہٹ گئی ہے ... ایک لاعلاج مرض، حد درجہ پستی فکر و معیار نظر کا پیدا ہو گیا ہے، مبتدعین و مقلدین کی نصرانیت کے مقابلے میں یہاں ظاہر پرستی و تقشف کی یہودیت سرایت کر گئی ہے"، باب دوم اور امور کے علاوہ ندوہ، علامہ شبلی، دارالمصنفین، مولانا سید سلیمان ندوی و مولانا دریابادی کے تعلق سے بڑا جامع ہے، دارالمصنفین سے تعلق کا اظہار اور جگہوں پر بھی ہے، لیکن اس میں مولانا مرحوم کی اس تقریر کا ذکر رہ گیا جو انہوں نے دارالمصنفین کی امداد کے سلسلے میں پارلیمنٹ میں کی تھی، تقسیم ہند کے بعد کے احوال پر مشتمل باب پنجم مولانا کی شب زندگی اور ہندوستانی مسلمانوں کے پرآشوب دور کی داستان ہونے کی وجہ سے خاص طور پر مطالعہ کے لائق ہے، فاضل مصنف مشاق اہل قلم ہیں، لیکن ضخامت کی وجہ سے شاید ان کو نظر ثانی کی فرصت نہیں ملی، کتابت کے اغلاط کے ساتھ بعض عبارتوں پر توجہ کی ضرورت تھی، مثلاً مکہ میں ابتدائی تعلیم کے بیان میں ماضی شکی کے افعال کی گردان نظر آتی ہے، اسی طرح چار سطری ایک اقتباس میں "پڑھائے، پڑھائی، پڑھایا، پڑھ لو، پڑھائی گئی اور پڑھائی شروع ہو گئی" کی تکرار ہے۔ اردو کی صحافتی سرمایہ، مولانا آزاد کو

زور دیا گیا تھا، شاعری کی طرف رجوع ہوئے وغیرہ جملے بھی ہیں، سٹرھ بیٹا بھی نامانوس
ہے، مولانا محمود الحسن دیوبندی کو ابوالحسن دیوبندی اور تہافۃ الفلاسفہ درخش کادیانی،
عزل واستقلال اور مصارف کی جگہ مخارج وضروریات جیسی کتابت کی غلطیاں ہیں،
لاتعسر کو لاتعتر، جاھدوا کو جاھنوا، لسان صدق کو لسان الصدق
لکھ دیا گیا ہے، وانھی ان الممسکن بھی ہے۔

اسوۂ حسنہ از جناب مولانا مجیب اللہ ندوی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و کتابت
و طباعت، مجلد، صفحات ۳۴۴، قیمت ۱۳۰ روپے، پتہ: جامعۃ الرشاد، رشاد نگر
اعظم گڈھ۔

ایمان، اقسام ایمان اور ارکان اسلام یعنی نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج کے متعلق اصلاً
یہ احادیث شریفہ کا منتخب مجموعہ ہے لیکن اس کی جدت و انفرادیت یہ ہے کہ ہر موضوع
کے تعلق سے اس میں پہلے آیات قرآنی کا التزام اور بعد میں اسی مناسبت سے آنحضورؐ اور
حضرات صحابہ کرامؓ کا اسوہ اور عملی نمونہ بھی پیش کیا گیا ہے، مقصد تالیف یہ ہے کہ کتاب
اسلامی تعلیمات کا مکمل اور اسلامی تاریخ و تہذیب کا مستند ماخذ ثابت ہو اور اسلام کے
نظام عقائد و عبادات کے زیر اثر دنیا میں اسلامی تہذیب کی مسلسل ترقی اور فروغ سے
اس اعتراض کا ردو ازالہ ہو کہ ابتدائی چالیس برس کے بعد اسلام کی اصل شکل باقی نہ رہی
اس طرح اس کتاب میں کلامی رنگ بھی شامل ہے، آخری باب جہاد و قتال کے عنوان سے
ہے جس کے متعلق کہا گیا کہ اگرچہ جہاد کا بیان عموماً معاملات کے ضمن میں آتا ہے، لیکن علماء
و محدثین کا ایک طبقہ اسے عبادات میں شامل سمجھتا ہے، فاضل مصنف کا ذوق بھی اسی طبقہ
کا حامی و موید ہے، کتابت کی صحت اور عمدہ طباعت بھی اس کتاب کی بڑی خوبی ہے۔

خطبات نبویؐ از جناب مولانا حبیب الرحمن ندوی مرحوم، متوسط تقطیع،
عمدہ کاغذ و کتابت و طباعت، مجلد، صفحات ۲۸۸، قیمت ۷۰ روپے، پتہ: فہیم بک
سیلرز، مرزا ہادی پورہ، چوک، مئوناتھ بھنجن۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے خطبات کی جامعیت، ایجاز، بلاغت اور تاثیر کے ذکر
و بیان سے ادب اسلامی کے صفحات ہمیشہ روشن و معمور رہے، علم و ادب اور اخلاق و حکمت
کے ان سب سے گراں مایہ موتیوں کو سلک واحد میں پرونے کی مبارک کوششیں بھی ہوتی
رہیں، اس کتاب کے لائق و ذی استعداد مولف نے تجارتی مشغولیت کے باوجود اردو میں
اسی مبارک سلسلے کے لیے جمع و ترتیب کی کوشش کی، افسوس کہ مصلحت اجل نے ان کو
زیادہ فرصت نہیں دی، تاہم انہوں نے خطبہ کوہ صفا سے حجۃ الوداع تک قریب چالیس
خطبات جمع کر لیے اور سادہ و آسان زبان میں ان کی تشریح بھی کر دی اور خطبات کے
محل و موضوع کی جانب ضروری اشارے بھی کر دیے، ان کی یہ کاوش قدر کی نظر سے دیکھی
جائے گی اور توقع ہے کہ آخرت میں یہ ان کے لیے مغفرت کا سامان بھی ثابت ہوگی۔

مطالعۂ بیدل فکر برگساں کی روشنی میں از علامہ اقبالؒ، ترتیب و ترجمہ
جناب ڈاکٹر تحسین فراقی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد، صفحات
۱۴۰، قیمت ۷۰ روپے، پتہ: اقبال اکاڈمی، ۱۱۶۔ میکلوڈ روڈ، لاہور، پاکستان۔

علامہ اقبال کے فلسفہ و کلام پر جن شخصیات کا اثر زیادہ نمایاں اور صاف محسوس
ہے ان میں بیدل عظیم آبادی بھی ہیں، جن کی شاعری کو انہوں نے سحر شکل اور معجزانہ
شان کہتے ہوئے ان کی تقلید کے دعویٰ کو گویا غیر ممکن قرار دیا تھا، علامہ کی نظر میں وہ
نویں صدی کے عظیم ہندو فلسفی اور اپنشد برہما سوترا اور بھگوت گیتا کے شارح شنکر

اچاریہ کے بعد ہندوستان کے سب سے بڑے مفکر شاعر تھے، اسی اثر پذیری کے باعث انہوں نے بیدل کے بعض افکار کا موازنہ اپنے ایک اور ممدوح برگساں کے خیالات سے کیا اور مقامات حقیقت و حرکت و حیرت، عنصر زمان و مکان، وجدان، تنزل، فنا اور حیات بعد الممات جیسے صوفیانہ و فلسفیانہ اشارات پر ان دونوں کے خیالات کی ہم آہنگی اور کہیں کہیں تضاد و تنافر پر بڑی لطیف بحث کی، یہ بھی لکھا کہ اگرچہ بیدل کی شرافت اور سادہ زندگی کی وجہ سے ان کو صوفی سمجھا گیا لیکن ان کی شاعری کے مافیہ پر توجہ نہیں دی گئی، یہ مختصر لیکن حد درجہ وقیع مضمون عرصہ تک غیر معلوم و غیر مطبوع رہا، اس کتاب کے فاضل مرتب کو یہ نادر تحریر اقبال میوزیم کے خزینے سے ہاتھ لگی تو انہوں نے پہلے اس کو اقبال ریویو میں اور پھر اردو ترجمہ اور خط اقبال میں اس کی اصل کے عکس کے ساتھ اس کتاب کی شکل میں شایع کر دیا، زیر نظر کتاب اس کا دوسرا اور تازہ ایڈیشن ہے، فاضل مرتب کا مقدمہ بھی کم اہم نہیں جس میں انہوں نے نثر اقبال کے مشکل مقامات کی ترجمانی بآسانی کر دی ہے، بیدل و برگساں کی فکری مماثلت ان کی نظر میں دلچسپ اور حیران کن ہے، تاہم انہوں نے اقبال کے بعض خیالات کے قابل بحث ہونے اور خود ان کی فکری تبدیلیوں کی نشاندہی بھی کر دی ہے، یہ اس لئے بھی ضروری تھا کہ اس مضمون کا زمانہ تحریر ۱۹۱۶ء کے قریب کا ہے، تصوف کی بعض اصطلاحوں کے متعلق علامہ کے خیالات میں اس وقت جو شدت اور تلخی تھی، بعد کے زمانے میں اس میں یقیناً کمی آگئی تھی، البتہ فاضل مرتب کے قلم سے قربت کے مفہوم میں مقاربت کا لفظ شاید احتیاط کے خلاف ہے، اسی طرح یہ جملہ بھی ہے کہ "متعدد جگہ بیدل نے جگہ پائی ہے۔"

ع۔ ص۔

تصانیف مولانا عبد السلام ندوی مرحوم

اسوہ صحابہؓ: (حصہ اول) اس میں صحابہ کرامؓ کے عقائد، عبادات، اخلاق و معاشرت کی تصویر پیش کی گئی ہے۔
قیمت ۵۰/ روپے

اسوہ صحابہؓ: (حصہ دوم) اس میں صحابہ کرامؓ کے سیاسی، انتظامی اور علمی کارناموں کی تفصیل دی گئی ہے۔
قیمت ۵۶/ روپے

اسوہ صحابیاتؓ: اس میں صحابیات کے مذہبی، اخلاقی اور علمی کارناموں کو یکجا کر دیا گیا ہے۔
قیمت ۲۰/ روپے

[حض]رت عمر بن عبد العزیزؒ: اس میں حضرت عمر بن عبد العزیز کی مفصل سوانح اور ان کے تجدیدی [کارنام]وں کا ذکر ہے۔
قیمت ۳۲/ روپے

[ا]مام رازی: امام فخر الدین رازی کے حالات زندگی اور ان کے نظریات و خیالات کی مفصل تشریح کی گئی ہے۔
قیمت ۳۵/ روپے

[ح]کمائے اسلام: (حصہ اول) اس میں یونانی فلسفہ کے مآخذ، مسلمانوں میں علوم عقلیہ کی اشاعت اور [...]ویں صدی تک کے اکابر حکمائے اسلام کے حالات، علمی خدمات اور فلسفیانہ نظریات کی تفصیل ہے۔
قیمت ۵۰/ روپے

[ح]کمائے اسلام: (حصہ دوم) متوسطین و متاخرین حکمائے اسلام کے حالات پر مشتمل ہے۔
قیمت ۳۰/ روپے

[شع]ر الہند: (حصہ اول) قدماء سے دور جدید تک کی اردو شاعری کے تغیر کی تفصیل اور ہر دور کے مشہور [اساتذ]ہ کے کلام کا باہم موازنہ۔
قیمت ۴۰/ روپے

[شع]ر الہند: (حصہ دوم) اردو شاعری کے تمام اصناف غزل، قصیدہ، مثنوی اور مرثیہ وغیرہ پر تاریخی و ادبی [حیثیت] سے تنقید کی گئی ہے۔
قیمت ۷۵/ روپے

[ا]قبال کامل: ڈاکٹر اقبال کی مفصل سوانح اور ان کے فلسفیانہ و شاعرانہ کارناموں کی تفصیل کی گئی ہے۔
قیمت ۸۰/ روپے

[تا]ریخ فقہ اسلامی: تاریخ التشریع الاسلامی کا ترجمہ جس میں فقہ اسلامی کے ہر دور کی خصوصیات ذکر [کی گئ]ی ہیں۔
قیمت ۱۲۵/ روپے

[ا]نقلاب الامم: سر تطور الامم کا انشاء پردازانہ ترجمہ۔ قیمت ۱۵/ روپے

[م]قالات عبد السلام: مولانا مرحوم کے اہم ادبی و تنقیدی مضامین کا مجموعہ۔ قیمت ۴۰/ روپے